

بنی اسرائیل سے اسرائیل تک





ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

جولائی 2021





بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

بنی اسرائیل سے اسرائیل تک

تین مذاہب کا مرکز

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

جولائی 2021ء

انتساب

شیخ احمد یاسین شہیدؒ کے نام

جنہوں نے فلسطین کی آزادی کے لیے اپنی جان بھی قربان کردی

طبع اول : جنوری 2022

کتاب : بنی اسرائیل سے اسرائیل تک

مصنف : ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

mushtaq.mangat@gmail.com

ناشر : عاصم پبلیکیشنز

B Revenue Employees Cooperative Housing Society 296

Lahore, Pakistan

طابع اور ملنے کا پتہ : صوفی سنز، 16 اردو بازار لاہو

04237227165, 042-37240282042

قیمت : Rs. 200

نوٹ:

اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام تر آمدنی غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ میں تعلیم حاصل کرنے والے ضرورت مند طالبعلموں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے خرچ کی جاتی ہے۔اس کارِ خیر میں صوفی سنز کا بھی مکمل تعاون حاصل ہے۔ وہ اس کتاب کی تقسیم بھی نیکی کے جذبہ کے ساتھ کر رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ کتاب ای بک کی شکل میں انٹرنیٹ پر رکھی گئی ہے۔آپ اسے ڈاؤنلوڈ کر سکتے ہیں۔ کسی کو بھی دے سکتے ہیں۔ اس کی آپ کو مکمل اجازت ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ویب سائٹس پر موجود ہے۔اگر کوئی دقت ہو تو آپ ہمیں ای میل بھیج کر بھی منگوا سکتے ہیں۔

https://taawun.org.pk/downloads/, and www.scribd.com

فہرست مضامین

بنی اسرائیل سے اسرائیل تک

حرفِ آغاز

فلسطین ایک قدیم علاقہ ہے جہاں انسان نے صدیوں پہلے رہنا شروع کیا تھا۔اس خطّے کی تاریخ اور موجودہ دور میں یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے مسائل کا ایک مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

میں نے فلسطین کی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے جن میں پہلا قبل مسیح کا دور ہے جب پہلی مرتبہ اس علاقے میں یہودیوں کی ریاست قائم ہوئی۔ دوسرا دور پہلی صدی عیسوی سے ساتویں صدی عیسوی تک کا ہے۔یہ وہ دور ہے جب فلسطین پر رومی عیسائی حکمران تھے۔ تیسرا دور وہ ہے جب یروشلم کو مسلمانوں نے فتح کیا اور اس پر تیرہ صدیوں تک حکومت کی، یہ دور سلطنت عثمانیہ کے خاتمے تک کا ہے۔ چوتھا دور وہ ہے جب یہ علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آیا اور یہودیوں کے یہاں آکر آباد ہونے سے موجودہ جنگی صورت حال تک۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ انگریزوں کے دور سے پہلے تک اس سارے خطّے کو فلسطین کے نام سے جانا جاتا تھا۔ 1948ء میں پہلی مرتبہ فلسطین کے دو حصّے کرکے ایک کو اسرائیل کا نام دیا گیا۔ اس لیے میں اس خطّے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے 1948ء سے پہلے کے واقعات کو بیان کرنے کے لیے فلسطین کا لفظ ہی استعمال کروں گا۔

فلسطین سے پہلے بھی اس خطّے کے کئی نام تھے جن کا ذکر اس مختصر مضمون کے احاطے سے باہر ہے۔ مولانا مودودیؒ نے بھی سورہ روم کی تشریح کرتے ہوئے اس علاقے کا نام فلسطین ہی لکھا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو تاریخ کی طرف لے کر جاؤں میں آپ کو اس علاقے کے جغرافیے کا کچھ احوال بتانا چاہوں گا۔ اس علاقے کے قرب وجوار کا علم آپ کیلئے اس علاقے کی تاریخ سمجھنے میں مفید ثابت ہوگا۔

حدوداربعہ فلسطین

اگر آپ دنیا کے نقشے کو دیکھیں تو آپ کو ایشیاء کے مغربی حصّہ میں ایک بہت بڑا جزیرہ نظر آئے گا۔ جسے جزیرہ عرب بھی کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ سعودی عرب کا تعارف کرواتے ہوئے اسے جزیرہ نما عرب کے نام سے بھی متعارف کرواتے ہیں۔ اس جزیرے کے مشرق میں خلیج فارس اور مغرب میں بحیرہ قلزم (جسے بحیرہ احمر (Red Sea) بھی کہتے ہیں) موجود ہے۔اس کے جنوب میں بحیرہ عرب جبکہ شمال میں بحیرہ روم (Mediterranean Sea) واقع ہے۔اس خطّے کو عام طور پر مغربی ایشیاء بھی کہا جاتا ہے۔ یاد رہے ایشیاء کو جغرافیائی طور پر پانچ حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، مشرقی ایشیاء، جس میں چین سے جاپان تک کے ممالک آتے ہیں، شمالی ایشیاء جس میں روس واقع ہے، جنوب مشرقی ایشیاء، جس میں بنگلہ دیش، بھارت، پاکستان اور افغانستان ہیں، مغربی ایشیاء جو ایران سے شروع ہو کر عرب ممالک سمیت اسرائیل تک ہے۔ پانچواں حصّہ وسط ایشیاء پر مشتمل ہے جس میں قازقستان اور ازبکستان وغیرہ واقع ہیں۔ انھیں وسطی ایشیائی ریاستیں بھی کہا جاتا ہے۔

جزیرہ عرب کے مشرق میں خلیج فارس، خلیج کے دوسری طرف ایران، مغرب میں بحیرہ احمر اس کے پار مصر اور سوڈان جبکہ شمال میں عراق، شام، بیروت، اردن، اسرائیل اور فلسطین کے ممالک واقع ہیں۔ یہ ممالک ایک طرف سے برّاعظم افریقہ، یورپ اور ایشیاء کے سنگم پر واقع ہیں۔

اگر آپ فلسطین اور اسرائیل کے علاقوں کو دیکھیں تو آپ کو بھی یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہی لگے گا۔ فلسطین کے مشرق میں دریائے اردن اور بحیرہ مردار (Dead Sea) موجود ہے۔ مغرب اور شمال مغرب میں بحیرہ روم واقع ہے۔ جنوب میں خلیج عقبہ واقع ہے (جس کے ساتھ شرم الشیخ واقع ہے، جو کہ مصر کا ایک مشہور سیاحتی شہر ہے)۔

فلسطین افریقہ اور ایشیاء کے سنگم پر واقع ہے۔ یورپ اور اس کے درمیان بحیرہ روم موجود ہے۔ ایک طرح سے اسے دنیا کا مرکزی حصّہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ فلسطین کی لمبائی 470 کلومیٹر اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی 130 کلومیٹر ہے۔ شمال اور جنوب میں اس کی چوڑائی بہت کم ہو جاتی ہے۔

اس مختصر تذکرے سے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ فلسطین ایشیاء کے انتہائی مغرب میں واقع ہے اور ایشیاء کا ہی حصہ ہے جبکہ اس کے چاروں اطراف عرب ممالک واقع ہیں۔

فلسطین اور اسرائیل کے اہم شہر

فلسطین اور اسرائیل کے چند شہروں کا تذکرہ بھی اس خطّے کی تاریخ سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

یروشلم: ایک قدیم اور مقدس شہر

یروشلم اس علاقے کا ایک اہم ترین شہر ہے اور اس خطے کے مرکز میں واقع ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں قبلہ اوّل یعنی مسجد القدس موجود ہے۔ یہودیوں کے نزدیک مقدس ترین مقام (دیوار گریہ) اور عیسائیوں کا ایک اہم اور تاریخی گرجا گھر بھی یہیں موجود ہے۔

یہ شہر بحیرہ روم اور بحیرہ مردار کے درمیان جوڈین پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں یہ واحد شہر جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ماننے والے تینوں مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے مقدس مقامات موجود ہے۔ ماضی میں ان تینوں مذاہب کے ماننے والوں نے اس شہر پر قبضے کے لیے آپس میں کئی جنگیں بھی لڑیں ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اس شہر کی آبادی آٹھ لاکھ کے قریب ہے۔ اس کا کنٹرول مشترکہ طور پر فلسطین اور اسرائیل کے پاس ہے۔ ایک طرح سے یہ ایک انٹرنیشنل شہر بھی مانا جاتا ہے۔

یروشلم میں پائے جانے والی مختلف عمارتوں اور کھنڈرات سے ماہرین یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ اس شہر میں دو ہزار سے تین ہزار قبل مسیح تک لوگ آباد تھے۔ کئی ہزار سال قبل مسیح میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں پہلا ہیکل (عبادت کی جگہ) تعمیر کیا گیا جسے ہیکل سلیمانی کہتے ہیں۔ اس کی باقیات میں سے ایک دیوار کو دیوار گریہ کہا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آپ کو یہودی بیٹھے نظر آتے ہیں۔ یہ مقام آلِ یہود کے نزدیک ایک مقدس ترین مقام ہے۔

ہیکل سیلمانی کو کئی بار تباہ کیا گیا اور بار بار بنایا بھی گیا۔ اس کی ایک طویل تاریخ ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ قبل مسیح کے دور میں یروشلم یونانی حکمرانوں کے تحت بھی رہا اور بخت نصر کے لوگ بھی اس پر حکمران رہے، پھر ایک وقت آیا جب پہلی صدی عیسوی میں یہ شہر اہل روم کے قبضے میں آگیا۔ اسی دور میں یہاں پر ہیکل سلیمانی کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں شہر میں کئی اہم عمارتیں بھی تعمیر کی گئیں۔ جن میں سے اکثر اب بھی موجود ہیں۔

یروشلم کا تبوک سے فاصلہ پونے پانچ سو کلومیٹر، قاہرہ سے ساڑھے سات سو کلومیٹر، عمان سے دو سو بیس کلومیٹر، بیروت سے چار سو تیس کلومیٹر اور دمشق سے یہ شہر سوا تین سو کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ اردن اور فلسطین کی سرحد کے درمیان دریائے اردن بہتا ہے جو اڑھائی سو کلومیٹر طویل ہے۔ یہودی اسے ایک مقدس دریا بھی سمجھتے ہیں۔

اسی شہر میں مسجد اقصی (مسلمانوں کا قبلہ اوّل جو خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے بعد تیسرا مقدس ترین مقام ہے) بھی مشرقی یروشلم میں واقع ہے۔ قرآن مجید کی سورت الاسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے اس مسجد کا ذکر کیا ہے۔ جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

''وہ پاک ہے جس نے راتوں رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی، جس کے ارد گرد ہم نے برکت رکھی ہے تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں، بے شک وہ سننے والا دیکھنے والا ہے''۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر معراج کے دوران مسجد حرام سے یہاں پہنچے تھے اور مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاء کی نماز کی امامت کرنے کے بعد آسمانوں کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔

احادیث کے مطابق دنیا میں صرف تین مسجدوں کی جانب سفر کرنا باعث برکت ہے جن میں مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی شامل ہیں۔ یہی وہ مسلمانوں کا قبلہ اوّل ہے جس کی طرف نماز کی فرضیت کے بعد 16 کئی ماہ تک مسلمان اپنا رخ اسی طرف کرکے ہی نماز ادا کرتے تھے۔ پھر ایک دن دوران نماز تحویل قبلہ کا حکم آیا اور مسلمانوں کا قبلہ خانہ کعبہ ہو گیا۔

میں نے اس شہر کی تفصیل جاننے کی کوشش کی تو مجھے بی بی سی اردو کی ویب سائٹ پر زبیر احمد صاحب کا ایک مضمون ،جس کا عنوان تھا ''اسرائیل جہاں فصیل کے اندر الگ دنیا آباد ہے'' جو فروری 2018 کو شائع ہوا، ملا اس مضمون کی مدد سے میں جو کچھ سمجھ سکا پیش خدمت ہے۔

یروشلم کے دو حصّے ہیں؛ ایک پرانا شہر جو فصیل کے اندر ہے جہاں جانے کے لیے آٹھ دروازے بنائے گئے تھے۔ اکثر مقدس مقامات یہیں پر موجود ہیں۔ اس کی مثال اندرون لاہور کی سی ہے جبکہ دوسرا بیرونی علاقہ ایک جدید شہر کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اندرون شہر کی تنگ گلیاں اس کے طرز تعمیر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ تاریخ میں یہ بھی ملتا ہے کہ گیارہویں صدی میں جب صلیبی جنگجو اس شہر میں داخل ہوئے تو

انھوں نے ساٹھ ہزار سے زائد مسلمانوں اور یہودیوں کا قتل عام کیا تھا۔ اس علاقے میں ایسے مکانات بھی پائے جاتے ہیں جو عرب اسرائیل جنگ سے قبل نصف اسرائیل اور نصف اردن میں تھے۔ یروشلم دنیا کا وہ واحد شہر ہے جو یہودیوں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے نزدیک صدیوں سے مقدس رہا ہے۔ اس لیے دنیا بھر سے یہاں پر زائرین کی ایک بڑی تعداد آتی ہے۔ دنیا بھر سے تینوں مذاہب کے ماننے والے سیاح یروشلم آتے ہیں۔۔

ایک مدّت سے اسرائیل کا یہ کہنا ہے کہ یروشلم پر ان کا حق ہے اور یہ شہر اسرائیل کا دارالحکومت ہے۔ حال ہی میں امریکی صدر ٹرمپ نے ان کے مطالبے کی حمایت بھی کی لیکن ابھی تک یہ معاملہ حل نہیں ہوا۔ اس طرح فی الحال یروشلم پر فلسطین اور اسرائیل دونوں کا قبضہ ہے۔ مشرقی حصّہ فلسطین کے اور مغربی حصّہ اسرائیل کے پاس ہے۔ فلسطین کے لوگوں کو اسرائیل جانے کے لیے اسرائیلی حکومت کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔

تل ابیب: اسرائیل کا دارالحکومت

اسرائیل کا دوسرا بڑا شہر تل ابیب ہے۔ اس کی آبادی قریباً پانچ لاکھ ہے۔ یہ شہر اسرائیل کی مغربی سرحد پر بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہے۔ اسے اسرائیل کا معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی کیپیٹل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ عالمی مالیاتی انڈیکس میں یہ شہر 25 ویں نمبر پر ہے۔ اس شہر میں واقع یونیورسٹی میں تیس ہزار سے زائد طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ غیر ملکی سفارت خانے بھی اسی شہر میں موجود ہیں۔

حائفہ: جس کی فتح میں ہندوستانی فوجیوں نے ایک اہم کردار ادا کیا

اسرائیل کا تیسرا بڑا شہر حائفہ (Haifa) ہے جس کی آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔ یہ تقریباً تین ہزار سال پرانا شہر ہے۔ یہ اسرائیل کی ایک بندرگاہ ہے جو بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہے۔ یہ تل ابیب کے شمال میں 90 کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ شہر اسرائیل کی معیشت میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

جنگ عظیم اوّل کے دوران فلسطین میں ترکوں اور انگریزوں کی ایک جنگ حائفہ کے مقام پر بھی ہوئی۔ اس جنگ میں انگریزوں کی فتح ہوئی۔ اس چھوٹی سی جنگ کی ایک دلچسپ کہانی بھی ہے جس کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ اس ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا۔

حائفہ اسرائیل کے شمال میں بحیرہ روم کے ساحل پر ایک قدیم بندرگاہ ہے۔ یہ پہاڑ کی ڈھلوان پر واقع ایک خوبصورت شہر ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دوہزار سال قبل بھی یہ بندرگاہ زیرِ استعمال تھی۔ ترکوں کے نزدیک بھی ایک اہم شہر تھا۔ وہ اس کی حفاظت کے لیے آخری دم تک لڑتے رہے۔

پھر 1918ء میں یہ شہر انگریزوں نے اپنے وفادار ہندوستانی فوجیوں کی مدد سے ایک خونریز لڑائی کے بعد قبضہ میں لے لیا۔ اس جنگ میں چالیس سے زائد ہندوستانی فوجی مارے گئے۔ ان کی قبریں بھی اسی شہر میں ہیں۔ اس جنگ کی یاد میں انگریزوں نے دہلی کے تین مورتی چوک میں تین ہندوستانی فوجیوں کے مجسّمے بھی بنا رکھے ہیں۔ نیتن یاہو بھی اس مقام پر آیا اور اس کی فرمائش پر اب اس چوک کا نام حائفہ تین مورتی چوک ہے۔

یاد رہے یہ اسی دور کا مجسمہ ہے جب ہندوستان میں مسلمان خلافت بچاؤ تحریک چلا رہے تھے۔ ایک طرف ہم خلافت کے حق میں تھے اور دوسری طرف ایک بڑی تعداد میں ہندوستانی لوگ (جن میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی شامل تھے) انگریزوں کی خاطر وطن سے ہزاروں میل دور دیارِ غیر میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے تھے۔

شہر پر قبضے کی یاد میں ہر سال 23 ستمبر کو یوم حائفہ منایا جاتا ہے۔ مودی جب اسرائیل گیا تو وہ بھی ان انگریزوں کے وفادار فوجیوں کی یاد میں بنائی گئی یادگار پر گیا تھا۔

فلسطین کے چند اہم شہروں کا تذکرہ بھی آپ کو فلسطین کی تاریخ سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ یاد رہے کہ فلسطین دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ ایک کو ویسٹ بنک کا نام دیا گیا ہے اور دوسرے کو غزہ کی پٹی کہا جاتا ہے۔

خان یونس

خان یونس غزہ کی پٹی کے جنوب میں واقع ہے۔ اس علاقے میں ایک طویل عرصے سے پناہ گزین کیمپ موجود ہے۔

الخلیل: یہودیوں کی نئی بستیاں

الخلیل جسے ہیبرون بھی کہا جاتا ہے جنوب مغربی کنارے پر واقع ایک ایسا شہر ہے جس کے ایک حصّہ پر یہودیوں نے اپنی بستی بسا رکھی ہے۔ یہ یروشلم سے 30 کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب میں تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ غزہ کے بعد فلسطینی علاقوں کا یہ دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی اڑھائی لاکھ کے قریب ہے۔ اس شہر کے قرب وجوار میں کئی تاریخی اور مقدس مقامات بھی موجود ہیں، جن میں ایک غار بھی شامل ہے۔ یہ یہودیوں کے نزدیک یروشلم کے بعد دوسرا مقدس شہر ہے۔ اس شہر کا کنٹرول بھی فلسطین اور اسرائیل دونوں کے پاس ہے۔ اس لحاظ سے یہ شہر انتظامی معاملات میں دو حصّوں میں تقسیم ہے۔

نابلس: فلسطین کا ایک تجارتی شہر

نابلس شمالی مغربی کنارے کا ایک شہر ہے جو یروشلم کے شمال میں تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کی مجموعی آبادی سوا لاکھ سے زائد ہے اور یہ فلسطین کا تجارتی اور ثقافتی مرکز بھی ہے۔ یہاں پر کئی اہم تعلیمی مراکز بھی موجود ہیں۔ اس شہر کی آبادکاری کی تاریخ رومیوں کے دور تک جاتی ہے۔

غزہ کی پٹی: ایک خودمختار فلسطینی علاقہ

یہ بحیرہ روم کے مشرقی ساحل پر ایک علاقہ ہے جس کے جنوب مغرب میں مصر واقع ہے اور اس کے ساتھ اس کی سرحد کی لمبائی 11 کلومیٹر ہے۔ مصر سے متصل علاقے میں فلسطین کا شہر رافعہ واقع ہے جبکہ اس کی مشرقی اور شمالی سرحد اسرائیل سے لگتی ہے جو 51 کلومیٹر طویل ہے۔ یہ یاد رہے جو دو علاقے فلسطین کے کنٹرول میں ہیں (یعنی ویسٹ بنک مغربی کنارہ اور غزہ کی پٹی) ان دونوں کے درمیان کوئی زمینی رابطہ نہیں ہے۔ غزہ کی پٹی پر حماس کا کنٹرول ہے۔

غزہ کی پٹی کی لمبائی 41 کلومیٹر جبکہ چوڑائی چھ سے بارہ کلومیٹر ہے۔ اس کا کل رقبہ 365 مربع کلومیٹر ہے۔ اس جگہ پر بیس لاکھ کے قریب فلسطینی آباد ہیں۔ یہ دنیا کا تیسرا گنجان آبادی والا علاقہ ہے۔ ایک طرح سے یہ تمام علاقہ اسرائیل کے محاصرے میں ہے۔

مصر کی طرف سے سرحد بند ہے اور اسرائیل بھی انھیں یہاں سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا اور یوں ایک طرح سے یہ علاقہ ایک بڑی جیل کا منظر پیش کرتا ہے جس میں بیس لاکھ فلسطینی آباد ہیں۔

مصری سرحدوں کی بندش اور اسرائیلی سمندری اور ہوائی ناکہ بندی کی وجہ سے کوئی بھی اس علاقے میں آنے جانے کے لیے آزاد نہیں ہے اور نہ ہی یہاں کے لوگ آزادانہ طور پر سامان درآمد یا برآمد کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ ترک شہریوں کی طرف سے امدادی سامان لے کر یہاں پر ایک بحری جہاز بھی آیا جس پر اسرائیل نے حملہ کر دیا تھا۔ اسے فورٹیلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ 2010ء کا واقعہ ہے۔ اور اس حملہ کے نتیجے میں نو کارکنان بھی ہلاک ہوئے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عثمانی سلطنت کے دور میں غزہ اس کا ایک اہم حصّہ تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد یہ علاقہ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ عربوں اور اسرائیل کی پہلی جنگ (جو 1948ء میں ہوئی تھی) کے نتیجہ میں 1967ء تک مصر اس علاقے پر قابض رہا۔ 1967 تک غزہ کی پٹی ایک مصری فوجی گورنر کے زیر انتظام تھی۔ بعد ازاں اس پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا، پھر ایک وقت آیا جب 1993ء میں اوسلو معاہدے کے تحت اس علاقے کو محدود خود مختاری دے دی گئی۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ غزہ پر اسرائیل کا براہ راست بیرونی کنٹرول اور غزہ کی اندرونی زندگی پر بالواسطہ کنٹرول برقرار ہے۔ اسرائیل کو غزہ کی فضائی، سمندری اور سات زمینی گزرگاہوں کا مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ اسرائیل کی فوج دفاع کے نام پر کسی وقت بھی غزہ میں داخل ہو سکتی ہے۔ غزہ کے لوگ اپنی بنیادی ضروریات جیسے پانی، بجلی، ٹیلی مواصلات اور دیگر سہولیات پوری کرنے کے لیے اسرائیل کے مرہون منّت ہیں۔

رفع : مصر اور غزہ کی پٹی کا ایک سرحدی شہر

رفع شہر غزہ کی پٹی کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ غزہ شہر سے 30 کلومیٹر کے فاصلہ پر موجود ہے۔ اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ یہاں کے زیادہ تر لوگ فلسطینی مہاجر ہیں۔ اس علاقے سے اسرائیل کے اعلانِ دستبرداری کے بعد اسے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جن میں سے ایک حصّہ فلسطین کے پاس اور دوسرا مصر کے پاس ہے۔ اس طرح کئی خاندان بھی تقسیم ہو گئے۔ فلسطین کے لوگ یہیں سے مصر آتے جاتے ہیں۔ اسے رفع بارڈر کراسنگ کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں پر یاسر عرفات بین الاقوامی ہوائی اڈہ بھی تھا جسے

اسرائیل نے تباہ کر دیا۔ شہر کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے وقت بفر زون بنانے کے لیے شہر کے ایک وسیع علاقے کو بھی خالی کروایا گیا۔

مغربی کنارہ: فلسطین کا ایک حصّہ

1948ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اردن نے دریائے اردن کے ''مغربی کنارے'' پر قبضہ کیا اور اس کا نام ویسٹ بنک یا مغربی کنارا رکھا گیا۔ اب اسے ہم اردو میں بھی ویسٹ بنک کے نام سے ہی پکارتے ہیں۔ یہ علاقہ 1967ء تک اردن کے قبضہ میں رہا۔ پھر وقت بدلا اور 1967ء میں ہونے والی چھ روزہ عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح یہ علاقہ اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔ آخر کار اوسلو معاہدے کے تحت یہ علاقے فلسطین کے کنٹرول میں آ گئے۔

بیت اللحم فلسطین کا ایک اہم شہر (Bethlehem)

بیت اللحم، ویسٹ بنک کا ایک بڑا شہر ہے۔ یاد رہے کہ یروشلم کا مشرقی حصّہ بھی ویسٹ بنک میں شامل ہے۔ اس کی آبادی پچیس ہزار کے قریب ہے۔ یہاں پر عیسائیوں کے بھی کئی مقدس مقامات موجود ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہونا بہتر ہے کہ یروشلم اور بیت اللحم کا درمیانی فاصلہ دس کلومیٹر سے بھی کم ہے۔ اس لیے یہ علاقے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یروشلم کے مغربی حصّہ پر اسرائیل کا قبضہ ہے جب کہ اس کا مشرقی حصّہ ویسٹ بنک میں شامل ہے۔ بیت اللحم کلی طور پر ویسٹ بنک میں شامل ہے۔ اس لیے اسے بھی بیت المقدس کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔

اسے نبیوں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس علاقے میں کئی پیغمبر بھی تشریف لائے تھے۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد یہ شہر انگریزوں کے کنٹرول میں آگیا۔

رملہ

رملہ، یروشلم کے شمال میں دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے اور اس وقت فلسطین حکومت کا پایۂ تخت بھی ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے کو حضرت خالد بن ولید نے فتح کیا تھا۔ بنوامیّہ کے حکمرانوں نے یہاں کئی عمارتیں بھی بنوائی تھیں۔ پھر ایک وقت آیا جب صلیبی جنگوں کے نتیجے میں اس شہر پر مسیحیوں نے قبضہ کر لیا جسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کیا۔ یہ شہر سطح سمندر سے تقریباً تین ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

باقی شہروں کی طرح سلطنت عثمانیہ کے بعد انگریزوں نے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ کسی وقت میں اردن بھی اس شہر پر قابض رہا ہے۔ آخر کار یہ شہر فلسطینی حکومت کے کنٹرول میں آگیا۔ اس شہر کی سب سے اہم بات اسرائیل کے خلاف جدّ و جہد کا آغاز ہے جسے انتفادہ بھی کہا جاتا ہے۔

اب تک میں نے آپ کی خدمت میں اسرائیل اور فلسطین کے اہم شہروں اور علاقوں کے بارے میں چند معلومات پیش کی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ان شہروں کے بارے میں بنیادی معلومات آپ کے لیے فلسطین کی تاریخ کو سمجھنے میں بے حد مددگار ثابت ہوں گی۔

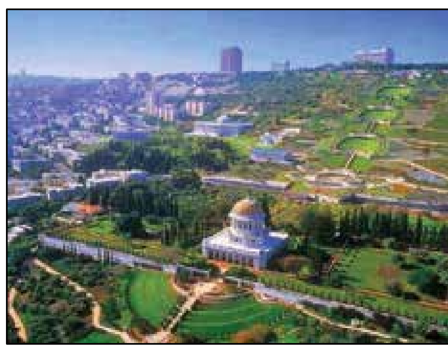




Jerusalem Photo Credit: https://www.time.com

Al-Khalil Photo Credit: https://www





Bethlehem Photo Credit: https://www.britannica.com

Haifa Photo Credit: https://www.pinterest.com

دورِ اوّل: قبل مسیح کا فلسطین

تاریخ دانوں نے اس خطے کی تاریخ کے بارے میں مختلف باتیں لکھی ہیں۔ جن میں سے درست بات تلاش کرنا کافی مشکل ہے۔ البتہ عیسوی دور کے واقعات میں خاصی مماثلت پائی جاتی ہے۔ مختلف ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

کہتے ہیں کہ اس علاقے میں انسانوں کی آبادی کا قدیم ترین ثبوت تقریباً ڈیڑھ لاکھ سال پہلے کا ملتا ہے (مجھے یہ بات مبالغہ لگتی ہے)، لیکن ایسا کئی لوگوں نے کہا ہے۔

تیچرنوولیٹن (Tchernov, Eitan) نے اپنی کتاب "The Age of 'Ubeidiya Formation (Jordan Valley, Israel) and the Earliest Hominids in the Levant" میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔

اگر آپ بحیرہ روم کو دنیا کے نقشے پر دیکھیں تو آپ یہ جان سکیں گے کہ اس کے چاروں طرف زمینی علاقے موجود ہیں۔ اس کے مشرق میں اردن، شام، لبنان فلسطین وغیرہ یعنی عرب ممالک پائے جاتے ہیں۔ اس کی مغربی سرحد اسپین سے ملتی ہے۔ شمال میں ترکی، یونان اور اٹلی واقع ہیں۔ اس کے جنوب میں افریقی ممالک مصر، لیبیا، مراکو، الجزائر (جسے الجیریا بھی کہتے ہیں) موجود ہیں۔

بحرہ روم کو بحیرہ احمر (Red Sea) سے ملانے کے لیے نہر سوئز بنائی گئی ہے۔ اس کا رابطہ بحیرہ اسود (Balck Sea) سے بذریعہ خلیج باسفورس ہوتا ہے۔ مغرب میں مراکو کے شمال میں ایک چودہ کلومیٹر سمندری پٹی بحیرہ روم کو بحیرہ اوقیانوس (Atlantic Sea) سے ملاتی ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں سے مراکشی مسلمان اسپین پر حملہ آور ہوتے تھے۔ طارق بن زیاد کا مشہور واقعہ بھی یہیں کا تھا۔ جبرالٹر (جبل الطارق) کی پہاڑی بھی اسی جگہ پر موجود ہے۔

یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ انسانی آبادی کا آغاز اسی خطے سے ہوا۔ زیادہ تر لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس کا مشرقی ساحل (جو عرب سے ملتا ہے) اور جنوبی ساحل (جو مصر سے ملتا ہے) کے علاقے میں دو ہزار قبل مسیح انسان آباد ہوئے تھے۔ جن میں اکثریت نے افریقہ سے نقل

مکانی کی۔ ہندوستان سے متعلق بھی لوگوں کا یہی خیال ہے کہ آریاؤں سے بھی پہلے لوگ افریقہ سے اس خطے میں آئے تھے۔ (شاید یہی وجہ ہوگی کی وادیٔ سندھ کے لوگ مصری لوگوں سے کاروبار بھی کرتے تھے اور ان کے آپس میں قریبی تعلقات بھی تھے۔

اسی خطے میں کئی قابلِ ذکر ریاستیں بھی موجود تھیں۔جس کی وجہ یہ ہے کہ اسی خطے سے یہودی اور عیسائی مذہب نے جنم لیا تھا۔

دو ہزار قبل مسیح میں اس علاقے میں سامریہ شہر کا ذکر ملتا ہے جو سامریہ خاندان کا دارالحکومت مانا جاتا ہے۔ مختلف کتابوں میں اسی دور کا ذکر فرعون کے حوالے سے بھی ملتا ہے۔کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہی وہ دور ہے جب اس علاقے میں پہلی مرتبہ ایک اسرائیلی ریاست کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔اسی وجہ سے جب یہودیوں کو دوبارہ ریاست بنانے کا موقع ملا تو انھوں نے نئی ریاست کا نام بھی اسرائیل ہی رکھا۔اس بات کا ذکر کئی جنگوں کی تاریخ پڑھتے ہوئے بھی ملتا ہے۔

میں اب تک جو جان پایا ہوں اس کے مطابق جب پہلی مرتبہ یہودی قبائل کو اقتدار ملا اور پھر ان کے توسیع پسندانہ اقدامات کی وجہ سے انھیں یہاں سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک مدّت تک اسرائیل پھر کبھی بھی دوبارہ ریاست نہ بن سکی۔اس بات کا تفصیلی ذکر یہودیوں سے متعلق لکھی گئی اس تحریر سے ہوتا ہے جو The LMLK Research Website پر اس نام سے موجود ہے۔

آثار قدیمہ کے ماہرین کے مطابق اسرائیل سلطنت ایک خوشحال ریاست تھی۔اُس دور میں قابلِ ذکر شہری ترقی بھی دیکھی گئی۔اس دور کی کئی عمارتوں کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ یاد رہے یہ سب اسلام اور عیسائیت سے پہلے کی باتیں ہیں۔

ہم تاریخ میں اکثر بابل کے باغات اور اس دور کی حکومت کا ذکر پڑھتے ہیں۔اسے انگریزی میں Babylon کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اردو میں ہم اسے بابل لکھتے ہیں۔اسی نام کا ایک شہر قدیم بابل کی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ یہ علاقہ موجودہ بغداد کے قریب ہی واقع تھا۔ یہ اسی دور کی بات ہے جب میسوپوٹیمیا کی ریاست کا ذکر ملتا ہے۔ان دونوں ریاستوں کی آپسی کشمکش کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔اس بات کا ذکر کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ پہلی مرتبہ یہودہ لفظ کا تصور اسی ریاست کی وجہ سے سامنے آتا ہے۔

بابل کی ریاست کے دوسرے دور میں (یعنی چھٹی صدی قبل مسیح میں) یہودہ بابل ریاست کا ایک شہر تھا۔ جیسے ہی بابل ریاست کا خاتمہ ہوا اس شہر کا کام بھی تمام ہوگیا۔ مختلف لوگوں نے اس بات کی تحقیق

کی ہے کہ لفظ یہودی کہاں سے آیا۔ جو میں جان سکا ہوں اس کے مطابق یہودی (انگریزی میں Jew)کا ذکر بائبل کے عبرانی لفظ یہودہ ہی سے نکلا ہے جس کا مطلب ''یہوداہ بادشاہ'' ہے۔ اس کا ایک مطلب ''ایک خدا کا پرستار'' بھی ہے۔

کچھ تاریخ دانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ عبرانی بائبل میں یہودہ ایک مذہبی رہنما کے چوتھے بیٹے کا نام تھا۔ جلاوطنی کے دوران ایک قبیلے کا نام بھی یہودہ رکھا گیا۔ اسی قبیلے نے کنعان کی سرزمین پر آباد کاری کی۔ (اس کا ذکر مولانا مودودیؒ نے حضرت موسیٰ کے دور میں ان کی قوم اور بچھڑے کی پوجا کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کنعان میں اس طرح کا رواج عام تھا)۔

یہودی، بنی اسرائیل، صیہونی

جب اسرائیل کی ریاست کا خاتمہ ہوا تو یہ نام ایک قبیلے کے لیے مختص ہو گیا۔ پھر جب اسرائیل کی بقیہ ریاست کا بھی خاتمہ ہو گیا تو یہودی اصطلاح تمام بنی اسرائیل کے لیے استعمال ہونے لگی اور جو اب تک ہو رہی ہے۔ قرآن میں بھی ان لوگوں کے لیے بنی اسرائیل کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ بنی اسرائیل نام کی ایک سورۃ بھی قرآن میں موجود ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر 62 میں لفظ ھادو بھی استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ مولانا مودودیؒ سمیت سب نے یہودی کیا ہے۔

اب تک جو میں سمجھا ہوں اس کے مطابق پہلے پہل یہودہ ایک علاقے کا نام تھا اور پھر وہاں رہنے والے لوگوں کے لیے استعمال ہونا شروع ہوا اور اب بنی اسرائیل لیے عمومی طور پر یہود یا ''Jew'' کا لفظ استعمال ہو رہا ہے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے، میرے لیے کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ البتہ ایک بات واضح ہے کہ مدینہ میں رہنے والے بنی اسرائیل کے لوگوں کے لیے لفظ یہودی ہی استعمال ہوتا تھا۔ ان سب کو یہودی قبائل کا نام ہی دیا گیا تھا۔ یہ بات سیرت کی کتابوں سے بھی واضح ہے۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں ایران کے بادشاہ سائرس نے دنیا کا ایک بڑا حصّہ فتح کیا تو بابل کے دوسرے دور کی ریاست بھی اس کے قبضہ میں آگئی اور بابل کا علاقہ فارس کی سلطنت کا ایک حصّہ بن گیا۔ غالب امکان ہے کہ اس دور میں اس علاقے کو پہلی مرتبہ فلسطین یا پلسٹین کا نام دیا گیا۔ سائرس کی موت کے بعد بننے والے بادشاہ کے کئی اقدامات کی وجہ سے مقامی لوگوں نے بغاوت کر دی۔ یہی وہ دور تھا جس میں فارس کے لوگوں نے یورپ کے کئی علاقوں پر قبضہ کیا۔ پھر ایک وقت آیا جب سکندر اعظم نے فارس کی

سلطنت کا خاتمہ کیا اور اس کے یونان پر کیے گئے مظالم کا بدلہ لیا۔ اس تمام عرصے میں بنی اسرائیل کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں تقریباً پانچ سو سال بعد یہودیوں نے ایک طویل عرصہ تک یروشلم، اس کے ہیکل اور کئی دیگر مقدس مقامات کی بے حرمتی کا دکھ سہنے کے بعد ایک مرتبہ پھر ان مقدس مقامات کو تعمیر کرکے اس شہر میں یہودی مذہب کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنا شروع کی۔ یہی وہ دور ہے جب حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوتی ہے اور یہود ان کی مخالفت میں اتر آتے ہیں۔ یہاں سے فلسطین کی تاریخ کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں روم کے بادشاہ عیسائی مذہب اختیار کر لیتے ہیں اور ایک مرتبہ پھر یہودیوں کو شہر سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔

دور دوم: فلسطین، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر

مسلمانوں کی آمد سے پہلے تک

فارس کے حکمرانوں کے زوال کے بعد اہل یونان نے اس علاقے پر اپنا راج شروع کیا جس کا آغاز سکندر سے ہوا اس نے مصر کے بعد فارس پر بھی قبضہ کر لیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ جب دوسری صدی عیسوی میں یہ علاقہ رومن سلطنت کا حصّہ بن گیا۔ اس دوران ایک مرتبہ پھر یہود یہاں سے نقل مکانی کر گئے لیکن فلسطین کے ایک چھوٹے سے حصّہ گیلیل (Galilee) پر وہ ضرور موجود رہے۔ اس طرح گیلیل ان کا ایک مذہبی مرکز بن گیا۔ ساتویں صدی عیسوی تک یہ علاقے بازنطینی حکمرانوں کے ماتحت رہے۔

یاد رہے بازنطینی سلطنت درحقیقت رومی سلطنت کی ہی ایک شکل ہے اور اسے مشرقی رومن سلطنت بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا (استنبول)۔ جب پانچویں صدی میں مغربی رومن سلطنت کو زوال آیا تو مشرقی روم محفوظ رہا۔ اس کی تباہی 1453ء میں سلطنت عثمانیہ کے ہاتھوں ہوئی۔ (رومی سلطنت کی ایک طویل تاریخ ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے اور نہایت ہی سبق آموز اور دلچسپ ہے)۔

قرآن پاک میں سورۃ روم میں رومیوں اور مجوسیوں کی جنگ کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ پہلے پہل رومیوں کو شکست ہوئی جس پر کفار مکہ نے بے حد خوشی کا اظہار کیا کیونکہ رومی اہل کتاب تھے اور اس لیے ان کی شکست مسلمانوں کی شکست تصور کی جاتی تھی۔ اس پر قرآن نے کہا کہ رومی عنقریب دوبارہ غلبہ حاصل کریں گے۔ یہ سن کر کفار مکہ نے مسلمانوں کا مذاق اڑایا۔ اسی دوران حضرت ابوبکرؓ کا مکہ کے ایک کافر سے سو اونٹوں کی شرط کا واقعہ بھی پیش آیا جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے ہوا تھا۔ مولانا مودودی (رحمۃ اللہ علیہ) نے سورۃ روم کے دیباچے میں اس پر تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ فارس کی فوج میں یہود بھی ایک کثیر تعداد میں شامل تھے۔ ان کی مدد سے مجوسیوں نے ایک مرتبہ رومی فوجوں کو شکست دی اور ایک بڑے علاقے پر قبضہ بھی کیا۔ پھر 627ء میں کئی جنگوں کے بعد رومی جیت گئے اور اس طرح قرآن کی پیش گوئی بھی سچ ثابت ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ بھی شرط جیت گئے۔



Old Palestine photo credit http:// www.wordpress.com



Life of Jews photo credit http:// www.972mag.com

دور سوم: فلسطین، حضرت عمرؓ کے دور سے انگریزوں کی فتح تک

اس سے پہلے کہ میں آپ کو فلسطین کی فتح کے بارے میں کچھ بتاؤں میں چاہوں گا کہ بازنطینی سلطنت اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والی جنگوں کے بارے میں کچھ عرض کروں۔

اگر آپ سعودی عرب کے نقشے کو دیکھیں تو آپ کو واضح طور پر یہ معلوم ہوگا کہ اس کے دو اطراف (مشرق اور مغرب) میں سمندر ہے اور جنوب میں یمن اور عمان واقع ہیں جبکہ اس کے جنوب مشرق میں عرب ریاستیں موجود ہیں۔ باقی دنیا سے اس کا زمینی رابطہ شمال میں واقع عراق، اردن، شام اور لبنان کے ذریعے ہی ہے۔

جب رومیوں اور ایرانیوں کی آپس میں جنگ ہوتی تھی تو بازنطینی، ترکی سے نیچے جنوب اور جنوب مشرق میں اور ایران کے لوگ اوپر شمال کی جانب جاتے تھے۔ عراق اور شام کے علاقے ہی ان دونوں بڑی سلطنتوں کے درمیان میدان جنگ بنتے تھے۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ نو ہجری کو غزوہ تبوک کا واقعہ پیش آیا تھا اور مسلمانوں کی فوج نبی محترم ﷺ کی قیادت میں تبوک گئی تھی۔ یہ مسلمانوں کی پہلی بین الاقوامی لڑائی تھی۔ اس کے بعد ہی ایران پر حملہ کیا گیا تھا۔ یہ بات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں نے بازنطینی سلطنت پر حملہ نہیں کیا تھا، بلکہ بازنطینیوں نے حملہ کرنے میں پہل کی تھی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مدینہ منوّرہ میں ایک اسلامی ریاست اپنے قدم جمار ہی ہے تو انھوں نے اسے ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس لیے ہی غزوہ تبوک کا واقعہ بھی پیش آیا۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عرب کے غسّانی خاندان (جو قیصر روم کے زیر اثر ملک شام پر حکومت کرتا تھا) نے بھی قیصر روم کو مدینہ پر فوج کشی پر ابھارا تھا۔ اس کے علاوہ مدینہ میں موجود یہودی بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ وہ بھی کسی غیر ملکی طاقت کے ذریعے مسلمانوں کو نقصان پہچانا چاہتے تھے۔ ا س کے لیے انھوں نے جنگ خندق کے موقع پر کفار مکہ کی مدد بھی کی تھی۔ اگر بازنطینی مدینہ پر حملہ آور ہوتے تو یقینی طور پر یہودی بھی ان کے لیے مددگار ثابت ہوتے۔ یاد رہے مدینہ سے تبوک کا فاصلہ چھ سو کلومیٹر سے زائد ہے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب یہ معلوم ہوا کہ بازنطینی افواج تبوک کی طرف سے حملہ کرنے کے لیے جمع ہو رہی ہیں، تو انھوں نے آگے بڑھ کر ان کا راستہ روکنے کا فیصلہ کیا۔ اس کام کے لیے

مسلمان فوج شمال کی طرف روانہ ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک میں بیس دن گزارے۔ لیکن بازنطینی فوج مقابلے پر نہیں آئی۔ اس سے یہ ہوا کہ بازنطینی سلطنت کا خوف مسلمانوں کے دل سے نکل گیا۔ یہ ایک طرح سے بازنطینی سلطنت کا مدینہ کی ریاست سے پہلا آمنا سامنا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بازنطینی سلطنت کے زوال کا آغاز تھا۔

یرموک کی لڑائی بھی تاریخ میں ایک اہم لڑائی کے طور پر جانی جاتی ہے اور اس کے بعد بھی کئی جنگیں ہوئیں۔ پھر وہ دن آیا جب مسلمان فوج نے یروشلم کا محاصرہ کر لیا اور شہر میں موجود عیسائی، مسلمانوں کی فوجی طاقت دیکھ کر صلح پر آمادہ ہو گئے۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا جس کا ذکر ضروری ہے۔

یروشلم کی فتح

عہد فاروقی میں خالد بن ولیدؓ اور ابوعبیدہ ابن الجراحؓ دو اہم ترین جرنیل مانے جاتے ہیں۔ ابوعبیدہ بن الجراحؓ ایک ماہر جنگی سپہ سالار تھے۔ آپ کی پرکشش شخصیت، سادہ اور پروقار زندگی کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپ سے دوست تو کیا دشمن بھی بے حد متاثر تھے۔ ابوعبیدہ ابن الجراحؓ جنگ یرموک کے بھی فاتح ہیں جس میں ہرقل کو شکست ہوئی۔ آپ ہی کے ہاتھوں بیت المقدس بھی فتح ہوا۔ آپ نے بیت المقدس میں پہلی نماز وہاں پڑھی جہاں آج کل مسجد اقصیٰ ہے۔ آپ کی آخری جنگ حمص کی وہ خونریز جنگ ہے جس میں ہرقل نے شام واپس لینے کی جدّوجہد کی لیکن ناکام ہوا اور اس کے بعد اس نے کبھی بھی شام کا رخ کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔

یروشلم تو فتح ہو گیا لیکن عیسائیوں نے مسلمانوں سے کہا کہ ان کی مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ شہر اس شخص کے حوالے کیا جائے جو مسلمانوں کا سب سے اہم فرد ہو۔ ان کی اس خواہش کے احترام میں حضرت عمرؓ ذاتی طور پر یروشلم آئے۔ تاریخ کی کتابوں سے یہ بھی ملتا ہے کہ کس طرح حضرت عمرؓ نے ایک ساتھی کی مدد سے بارہ سو سے زائد کلومیٹر کا فاصلہ باری باری اونٹ پر سوار ہو کر کیا تھا۔ یروشلم پہنچتے وقت اونٹ پر بیٹھنے کی باری ساتھی کی تھی۔ وہ اس شان سے یروشلم میں داخل ہوئے کہ ساتھی اونٹ پر سوار تھا اور آپؓ اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیدل چل رہے تھے۔ یہ واقع 637ء کا ہے۔ اس کے بعد سے فلسطین کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔

مسلمان دسویں صدی عیسوی تک فلسطین پر حکمران رہے۔ اس دوران یہاں کئی مسلمان خاندانوں نے حکومت کی جن میں خلفائے راشدین، اموی حکمران، عباسی، فاطمی اور سلجوقیوں کے علاوہ بھی کئی لوگ شامل ہیں۔ اس دوران عیسائی اپنی طاقت جمع کرتے رہے اور یورپی علاقوں میں ان کی کئی مضبوط ریاستیں بھی معرض وجود میں آئیں۔ پھر ایک وقت آیا جب انھوں نے فلسطین کو دوبارہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا اور 1099ء میں پہلی صلیبی جنگ کے نتیجے میں یروشلم کا محاصرہ کر لیا۔

تاریخ میں اس حملے کی تفصیل ناقابلِ بیان سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ عیسائی فوجوں نے یروشلم کی فتح کے بعد تقریباً ساٹھ ہزار یہودیوں اور مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اس جنگ میں یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر عیسائی فوج کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ صلیبی جنگوں کا سلسلہ تقریباً نوے سال تک چلتا رہا۔ پھر تاریخ نے دیکھا کہ 1187ء میں سلطان صلاح الدین نے صلیبیوں کو شکست دی اور یروشلم سمیت تمام فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح کی خاص بات یہ تھی کہ صلاح الدین ایوبی نے ایک حکم جاری کیا جس میں یہودیوں کو یروشلم میں واپس آنے اور آباد ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ ایک تاریخی بات ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہودی فلسطین میں آباد ہیں۔

یاد رہے یہودیوں کو پہلے فارس کے سائرس نے ملک بدر کیا، پھر ایک مرتبہ روم کے بادشاہ نے انھیں دیس سے نکال دیا تھا۔ اس بار ایک مسلمان حکمران نے انھیں واپس آکر آباد ہونے کی دعوت دی تھی۔ اس سے پہلے حضرت عمرؓ عیسائیوں کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کرنے کا معاہدہ کر چکے تھے لیکن جب عیسائیوں نے اسے فتح کیا تو ایسا خون خرابہ کیا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اب جب یہودی، عیسائی حکمرانوں کی مدد سے فلسطین پر دوبارہ قابض ہوئے تو انھوں نے مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمان فاتحین نے کیسا رویہ رکھا جبکہ یہودی اور عیسائی لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا۔

حضرت عمرؓ کے عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کے انگریزی ترجمہ۔

Source: https://ilmfeed.com/how-caliph-umar-treated-christians-under-his-rule/

The following is how Islam's second caliph — Umar ibn al-Khattab (May Allah be pleased with him) treated Christians after the conquest of Jerusalem.

"In the name of God, the Merciful, the Compassionate. This is the assurance of safety which the servant of God, Umar, the Commander of the Faithful, has given to the people of Jerusalem. He has given them an assurance of safety for themselves for their property, their churches, their crosses, the sick and healthy of the city and for all the rituals which belong to their religion. Their churches will not be inhabited by Muslims and will not be destroyed. Neither they, nor the land on which they stand, nor their cross, nor their property will be damaged. They will not be forcibly converted.

The people of Jerusalem must pay the taxes like the people of other cities and must expel the Byzantines and the robbers. Those of the people of Jerusalem who want to leave with the Byzantines, take their property and abandon their churches and crosses will be safe until they reach their place of refuge. The villagers may remain in the city if they wish but must pay taxes like the citizens. Those who wish may go with the Byzantines and those who wish may return to their families. Nothing is to be taken from them before their harvest is reaped.

If they pay their taxes according to their obligations, then the conditions laid out in this letter are under the covenant of God, are the responsibility of His Prophet, of the caliphs and of the faithful. " *Tareekh At-Tabari 2/449*

یہودیوں کی فلسطین میں آمد

اب تک ہم اس پر بات کر چکے ہیں کہ یہودیوں کو ایک عیسائی بادشاہ نے دوسری صدی عیسوی میں فلسطین سے نکالا اور وہ چوتھی صدی عیسوی میں ایرانیوں کی مدد سے ایک مختصر عرصے کے لیے فلسطین میں آئے لیکن انھیں جلد ہی یہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ مگر پھر بھی وہ ایک قلیل تعداد میں یہاں موجود ضرور رہے۔ پھر انھوں نے یہاں آباد ہونے کے لیے ایک طویل مدتی منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کے تحت وہ انفرادی طور پر فلسطین میں آکر آباد ہونے لگے۔

تیرہویں صدی میں جب فلسطین پر مسلمان حکمران تھے تو وہ ایک بڑی تعداد میں تاجروں کے روپ میں یروشلم آ کر آباد ہونا شروع ہو گئے۔ اس دوران انھوں نے اپنی ایک عبادت گاہ کی بنیاد بھی رکھی۔ اس سے قبل فلسطین میں ان کی کوئی عبادت گاہ نہیں تھی۔ ہیکل سلیمانی بھی ایک غیر آباد جگہ تھی۔

جس دور کا آغاز 637ء میں حضرت عمرؓ کی یروشلم آمد سے ہوا (درمیان میں نوے سال کے لیے عیسائی بھی حکمران رہے اور دوبارہ یہ سلسلہ صلاح الدین ایوبیؒ نے شروع کیا) اس کا خاتمہ 1917ء میں، تیرہ صدیاں گزرنے کے بعد انگریزوں کے ہاتھوں ہوا۔ اسی دور میں اس کی محافظ سلطنت عثمانیہ کا سورج بھی غروب ہو گیا۔ یہاں سے فلسطین کا چوتھا دور شروع ہوتا ہے۔


بسم الله الرحمن الرحيم

العهدة العمرية

عمر بن الخطاب

The Treaty of Hazrat Umar with Christian of Palestine

Photo Credit: https://www.islam21c.com



Mosque in Jeroselum Photo Credit: https://ilmfeed.com

دورِ چہارم: جنگِ عظیم اوّل اور فلسطین

فلسطین کے آخری مسلمان حکمران عثمانی تھے جنہوں نے 1517ء سے 1917ء تک چار سو سال یہاں حکومت کی۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد 1917ء میں انگریزوں نے اسے فتح کیا اور یوں 1187ء سے 1917ء تک سات سو تیس سال یہ شہر مسلمان حکمرانوں کے زیر اثر رہنے کے بعد سلطنت برطانیہ کا حصّہ بن گیا اور مسلمان محکوم بن گئے۔ انگریزوں کی اس فتح میں یہودیوں کا ایک اہم کردار تھا۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہوا جیسے ساتویں صدی عیسوی میں انھوں نے اہل ایران کی مدد سے اس شہر کو فتح کیا تھا۔ اب کی بار انھوں نے عیسائی مذہب کے ماننے والے انگریزوں کی مدد سے اس شہر پر قبضہ کروایا۔

انگریزوں نے یہودیوں سے یہ وعدہ کیا کہ وہ فلسطین میں ایک الگ ملک بنانے میں ان کی مدد کریں گے۔ انھوں نے یو این او کی مدد سے 1948ء میں اسرائیل کی شکل میں یہودیوں کو ایک الگ ملک بنا کر دیا، اس کی سرحدیں روز بروز پھیلتی جارہی ہیں اور اب فلسطین کے ستر فیصد سے زائد حصّے تک پہنچ گئی ہیں اور وہ جو سات صدیوں سے یہاں آباد تھے، وہ سمٹ کر غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے تک محدود ہو گئے ہیں۔

انگریزوں نے یہ سب کچھ کیسے کیا؟ کس کس نے اس کام میں ان کی مدد کی؟ صیہونی تحریک کب شروع ہوئی؟ کس نے اسے پروان چڑھنے میں اہم کردار ادا کیا؟ اس کا احوال جاننا ضروری ہے۔

یروشلم پر 1099ء میں صلیبی حملہ آوروں نے قبضہ کر لیا۔ اس وقت یہ خطے فاطمی حکمرانوں کے ماتحت تھا۔ محاصرے کے دوران مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں نے بھی صلیبی فوجوں کا مقابلہ کیا لیکن شکست ان کا مقدر بنی۔ مزید قتل و غارت سے بچنے کے لیے کثیر تعداد میں یہودی اس شہر سے نقل مکانی کر گئے اور عرب سمیت دنیا کے دیگر علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں یہودیوں کی بڑی تعداد فلسطین میں آباد تھی اور انھیں ہر طرح کی شہری سہولتیں بھی میسّر تھیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنے شہر کی حفاظت کے لیے حملہ آوروں سے جنگ بھی کی۔

سلطان صلاح الدین نے جنگ جیت کر یہودیوں کو یروشلم میں واپس آنے اور آباد ہونے کی دعوت دی۔ جو ایک طرح سے نئے سرے سے یہودیوں کی آباد کاری تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ صہیونی تحریک اٹھارویں صدی میں شروع کی گئی، لیکن میں اس بات کو زیادہ حقیقت کے قریب سمجھتا ہوں کہ سلطان ایوبی کی دی گئی دعوت کے بعد سے ہی یہودیوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ ہر چند صدیوں بعد بے دخل ہونے سے بہتر ہے کہ فلسطین کے ایک حصّے پر اپنی حکومت قائم کر لی جائے، اور پھر انھوں نے ایسا کر دکھایا۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ 1211ء میں فرانس اور انگلینڈ سے تین سو سے زائد یہودی مذہبی رہنماؤں نے فلسطین کا رخ کیا۔ اس سے ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کے بعد بھی یہودی یہاں آتے رہے۔ یہ سب انھوں نے ایک خاص منصوبہ کے تحت کیا۔ اس سے مسلمان حکمرانوں کو پریشانی ہوئی اور انھوں نے اسے روکنے کی کوشش بھی کی جو زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سولہویں صدی کے اوائل تک یہودیوں کی آبادی دس ہزار سے بڑھ گئی تھی۔

پھر ایک وقت آیا جب 1516ء میں فلسطین سلطنت عثمانیہ کا حصّہ بن گیا۔ ان کے دور حکومت میں کئی مرتبہ بغاوت بھی ہوئی لیکن سلطنت عثمانیہ اس پر قابو پانے میں کامیاب رہی۔ یاد رہے عرب سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کرنے میں پیش پیش تھے۔ انھوں نے اس کام کے لیے فرانس کی مدد بھی حاصل کی۔ اس سب کے باجود سلطنت عثمانیہ کا قبضہ اس وقت تک برقرار رہا جب تک پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کے ہاتھوں سلطنت عثمانیہ کا مکمل خاتمہ نہیں ہو گیا۔ اس سلطنت کے خاتمے میں عربوں نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا جس کے بدلے میں انگریزوں نے کئی مفتوحہ علاقے عربوں کے حوالے کر دیئے۔

اس کے بعد ہی کئی نئے عرب ممالک معرض وجود میں آئے۔ یہ بھی تاریخ کا ایک دلچسپ باب ہے جو جاننے سے تعلق رکھتا ہے۔

سلطنت عثمانیہ کے زوال کا مختصر احوال آپ کے لیے فلسطین کے پورے مسئلے کو جاننے میں کارگر ثابت ہوگا۔

سترہویں صدی کے آغاز سے ہی سلطنت عثمانیہ نے یورپ پر اپنا معاشی اور فوجی غلبہ کھونا شروع کر دیا۔ اس وقت یورپ میں صنعتی انقلاب کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ سترہویں صدی میں جب ویانا کی لڑائی میں

عثمانیہ سلطنت کو شکست ہوئی تو اس نے ان کی کمزوری کو ظاہر کر دیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی ممالک نے عثمانیہ سلطنت سے آزادی حاصل کر لی۔ اسی دوران رومانیہ، سربیا اور بلغاریہ نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا۔ 1912ء اور 1913ء میں ہونے والی بلقان جنگ کی شکست نے بھی سلطنت کے زوال میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ (جو ایک کمزور ریاست تھی) نے جرمنی، آسٹریا اور ہنگری کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ بالآخر اسے اکتوبر 1918ء میں شکست ہو گئی اور ترکی "یورپ کے بیمار" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ پھر اس بیمار کے زیر تسلط علاقے برطانیہ، فرانس، یونان اور روس کے مابین تقسیم ہو گئے۔ فلسطین کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ یہ علاقے انگریزوں کے قبضے میں چلے گئے۔ سلطنت عثمانیہ کا باضابطہ خاتمہ 1922 میں ہوا جب عثمانی سلطان کا لقب ختم ہو گیا اور ایک جرنیل مصطفیٰ کمال اتاترک کو ترک جمہوریہ کا سربراہ بنا دیا گیا۔

جنگ کے بعد ایک معاہدے کے تحت موجودہ فلسطین اور اسرائیل کا بیشتر حصّہ برطانیہ کے پاس چلا گیا۔ انھوں نے اس سارے علاقے کو فلسطین کا نام دیا جس پر 1948ء تک ان کا قبضہ رہا۔ ہندوستان میں یہودیوں کی موجودگی کی تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے علم ہوا کہ یہودی ہندوستان میں تین ہزار سال پہلے سے آباد ہیں۔ ٹائمز آف اسرائیل نے حال ہی میں ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ آندھرا پردیش میں ایسے یہودیوں کی ایک کثیر تعداد رہتی ہے جس کا تعلق افریقہ میں مقیم یہودی قبیلے افرائیم سے ہے اور وہ اب " تلگ" زبان بولتے ہیں۔ اس سے اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ صدیوں پہلے ہندوستان کے جنوب میں رہنے والے لوگ افریقہ سے نقل مکانی کر کے آئے تھے، لیکن ان میں سے بہت کم ہی مقامی معاشرت کا حصّہ بن سکے۔ ان لوگوں میں سے بھی ایک قابلِ ذکر تعداد اسرائیل جا رہی ہے۔ جنوبی ہندوستان کے علاقے کوچین میں ایک قدیم یہودی عبادت گاہ بھی پائی جاتی ہے جس کی دیوار پر لکھا ہوا ہے کہ یہ عبادت گاہ سینکڑوں سال پہلے تعمیر کی گئی تھی۔

صہیونی تحریک: آغاز سے اب تک

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ انیسویں صدی میں صہیونی تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک کا مقصد فلسطین کو تقسیم کرکے یہودیوں کے لیے ایک الگ ملک کا حصول تھا۔ جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں ذکر کیا ہے کہ یہودی ایک عرصہ سے ایسا چاہتے تھے، وہ ایک الگ بات ہے کہ تھیوڈر (Theodor Herzl) کو موجودہ صہیونی تحریک کا بانی مانا جاتا ہے۔ اسرائیل کا قیام اسی تحریک کا ایک کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

2007ء میں ایک مرتبہ جب میں مانچسٹر کی ایک مسجد سے جمعہ کی نماز کے بعد باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک صاحب پمفلٹ تقسیم کر رہے تھے جس پر لکھا ہوا تھا کہ ہم مارکس اینڈ اسپینسر کے مال کے سامنے ایک مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں اور آپ مسلمانوں کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ یہ اپیل ایک یہودی تنظیم کی طرف سے تھی (امام صاحب نے بھی اس مظاہرے میں شرکت کی اپیل کی تھی)۔ میرے لیے یہ بات بڑی حیران کن تھی کہ ایک یہودی تنظیم، یہودیوں کے سب سے بڑے خیر خواہ کے خلاف مظاہرہ کرنے جارہی ہے۔ اس پر میں نے اپنے دوست ڈاکٹر مقصود سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہودی بھی دو حصّوں میں تقسیم ہیں۔ ایک وہ جو اسرائیل کے حامی ہیں اور مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں (انھیں عام طور پر صہیونی (Zionsit) کہا جاتا ہے) اور دوسرے وہ جو ان کے مخالف ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تمام یہودی مسلمان دشمن نہیں ہیں۔

عام طور پر ان سب لوگوں کے لیے لفظ یہودی ہی استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ صہیونیوں کی تعداد دوسرے گروہ کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے، لیکن میں اس تحریر میں لفظ صہیونی ہی استعمال کروں گا۔ میں یہاں پر حالیہ صہیونی تحریک کی ایک مختصر داستان ضرور بیان کرنا چاہوں گا۔

میں نے یہ جاننے کی بہت کوشش کی کہ (Zionist) کا ترجمہ صہیونی کیسے ہو گیا، لیکن مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ عربی میں بھی اسے صہیونی ہی لکھا جاتا ہے۔ عمومی طور پر یہ اصطلاح قیام اسرائیل کے حامیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ فلسطین کے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ یہودیوں کے فلسطین

میں قیام کے خلاف نہیں ہیں البتہ وہ یہودیوں کے لیے ایک الگ ملک اسرائیل کے قیام کے خلاف ضرور ہیں۔

موجودہ صہیونی تحریک کا آغاز مشرقی یورپ سے ہوتا ہے۔ پہلی مرتبہ اس اصطلاح کو آسٹریا کے ایک یہودی نے استعمال کیا۔ عبرانی زبان میں Zion کا لفظ یروشلم کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہودی پہلے دن سے ہی صہیونی تحریک کا مقصد یروشلم کا حصول ہی سمجھتے ہیں۔

تمام صہیونیوں کا ایک ہی خواب تھا کہ وہ کسی طرح فلسطین میں (اپنے آبائی وطن میں) دوبارہ سے ایک الگ ملک قائم کریں۔ وہ فلسطین کی زمین پر وہ اپنا حق جتاتے تھے۔ اس کام کے لیے دنیا کے مختلف مقامات پر بسنے والے یہودیوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا شروع کیا گیا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ دوہزار سال قبل وہ اس علاقے میں حکمران تھے اور انھیں وہاں سے نکالا گیا تھا، اب وقت آگیا ہے کہ اپنے ملک کو دوبارہ حاصل کیا جائے۔ (میں نے پچھلے صفحات میں قبل مسیح ایک اسرائیل نام کی ریاست کا ذکر کیا تھا)۔ دنیا میں جمہوری طرز سیاست کے فروغ کی وجہ سے انھوں نے یہ طے کیا کہ فلسطین میں ان کی کثیر تعداد میں آبادکاری ہی ایک قابل عمل اور مناسب راستہ ہے۔ اس کام کے لیے انھوں نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی ترغیب دی اور پھر ایسا ہی ہوا۔

جن لوگوں نے صہیونی تحریک کے نظریات کو پسند کیا وہ صہیونی کہلائے اور ان لوگوں کی نقل مکانی کا سلسلہ پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گیا۔ اس سے قبل بھی یہودی فلسطین میں آتے رہے تھے لیکن وہ کھلے عام کبھی بھی اپنی آمد کا مقصد اسرائیل کا قیام نہیں بتاتے تھے۔

یہ سب جان کر میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے ذہنوں میں ایک الگ وطن کی خواہش تو طویل عرصے سے موجود تھی لیکن وہ اس موقع پر (جب کہ وہ ابھی کمزور تھے اور سامنے سلطنت عثمانیہ بھی موجود تھی) کھلے عام اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایسا انھوں نے اُسی وقت کیا جب انھوں نے سمجھا کہ اب وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ کے دور میں فلسطین میں یہودی آبادی کا تین فیصد بھی نہیں تھے۔ وہاں دس فیصد عیسائی تھے اور نوّے فیصد کے قریب مسلمان آباد تھے۔

صہیونی تحریک کا باقاعدہ آغاز آسٹروہنگری کے صحافی تھیوڈور ہرزل نے کیا۔ اس نے 1897ء میں ایک کتاب ڈیر جوڈین اسٹاٹ (یہودی ریاست) لکھی جس میں اس نے دنیا بھر کے یہودیوں کو فلسطین میں نقل مکانی کے لیے کہا۔

صہیونی تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی پہلی جنگ عظیم کے بعد مشرقی یورپ خاص طور پر جرمنی میں یہودیوں پر ہونے والے مظالم نے صہیونی تحریک کے لیے ایک مہمیز کا کام کیا اور اپنے لیے ایک الگ وطن کی ضرورت کے نظریے کو اکثر یہودیوں نے اپنایا اور اس کام کے لیے اپنی کوششیں مزید تیز کر دیں۔

انیسویں صدی میں روس میں ایک پروگرام کے تحت یہودیوں کے خلاف ایک مہم چلائی گئی۔ جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں یہودیوں کا قتل عام کیا گیا۔ دنیا کے کئی ممالک خاص طور پر مشرقی یورپ میں اس طرح کے واقعات نے یہودیوں کی اپنے لیے ایک الگ وطن کی خواہش کو مزید تیز کر دیا۔

ایک اور بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ سب یہودی ایسا نہیں چاہتے تھے۔ کچھ کا خیال تھا کہ انھیں اسی ملک کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیے جہاں وہ رہتے ہیں، لیکن صہیونیت کے حامیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا۔ اس دوران لاکھوں کی تعداد میں یہودی فلسطین آکر آباد ہونا شروع ہو گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے ایسا مذہبی نقطہ نظر سے کم اور سیاسی بقاء کی جنگ کے نقطہ نظر سے زیادہ کیا۔ اب تک جو میں نے پڑھا اس کے مطابق یہودی اس علاقے میں مذہبی معاملات کو بہتر طریقے سے ادا کرنے کی خاطر نقل مکانی نہیں کر رہے تھے۔ وہ یہ سب کچھ اپنی سیاسی بقاء کی خاطر کر رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ مذہب کی وجہ سے نقل مکانی کر رہے ہوں اور کچھ سیاسی وجوہات کی بنا پر۔

یہ وہ وقت تھا جب برطانیہ جنگ عظیم اوّل کی وجہ سے ایک مشکل دور سے گزر رہا تھا۔ اس وقت وہ دنیا کے بیشتر حصّوں پر قابض تھے اور اپنے ہی بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ ایسے موقع پر یہودیوں نے انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے تحت انھوں نے برطانیہ کی مدد کی اور اس کے بدلے میں برطانیہ نے ان کے لیے ایک الگ وطن کی حمایت کا وعدہ کیا اور پھر صہیونیت کا وہ پرچار (جو 1897ء میں شروع ہوا) 1948ء میں اسرائیل کی شکل میں سامنے آگیا۔

ان پچاس سالوں میں ایک نئے ملک کی بنیاد، دنیا بھر سے یہود کی ایک ویران اور پسماندہ خطے میں آمد، کثیر تعداد میں ان کی بستیاں اور ہر سال ان کے زیرِ قبضہ علاقے میں اضافہ ممکن ہوا اس سب میں یہودیوں کا ایک بڑا کردار تھا لیکن اس کے ساتھ مغرب اور کئی مشرقی ممالک کی حمایت نے ان کا کام آسان کر دیا۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ اکیسویں صدی کے اوائل تک پوری دنیا میں بسنے والے یہودیوں کی چالیس فیصد سے زائد آبادی صرف اسرائیل میں رہتی تھی۔ ایک لحاظ سے یہ پچھلے دو ہزار سالوں میں یہودیوں کی سب سے بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے۔ ایسا اب تک کبھی نہیں ہوا کہ ایک ملک ہو جس میں نوّے فیصد سے زائد لوگ نقل مکانی کر کے آئے اور انھوں نے نہ صرف وہ علاقہ پہلے سے رہنے والے باشندوں سے بزور طاقت چھینا ہو بلکہ دولت کا سہارا لے کر اسے خریدا بھی ہو۔ اب تک کی معلوم تاریخ میں ایسا صرف اسرائیل میں ہی ہوا ہے۔

اسرائیل میں یہودیوں کی نقل مکانی

اب تک جو بات میں نے پچھلے صفحات میں کی ہے اس کا تعلق صہیونی تحریک سے تھا۔ اس تحریک کے آغاز سے قبل اور بعد میں کس طرح یہودی نقل مکانی کرکے اسرائیل میں آباد ہوئے، یہ بھی جاننے کے لائق ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ پچھلے دوہزار سال سے یہودی کبھی بھی یروشلم کی محبت سے آزاد نہیں ہوئے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ البتہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انیسویں صدی میں جب روس سمیت مشرقی یورپ میں ان پر زندگی تنگ کر دی گئی تو انھوں نے یروشلم آنے کے لیے ایک تحریک کا آغاز کیا۔ اس کا نام انھوں نے عالیہ (Aliyah) رکھا، یہ عبرانی زبان کا ایک لفظ ہے جس کا مطلب اسرائیل کی طرف نقل مکانی کرنا۔ یاد رہے کہ اسرائیل کی حکومت قانون کے مطابق ہر یہودی کو اسرائیل آنے پر رہائش اور اسرائیلی شہریت دینے کی پابند ہے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سولہویں صدی کے وسط میں پرتگال میں موجود سلطنت عثمانیہ کی حمایت سے پرتگالی یہودیوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اسی دور میں سلیمان اوّل نے یورپ کے ساتھ رابطہ کرکے یہودیوں کو قید سے نجات دلائی۔ آج سے پانچ سو سال پہلے وہ ایک عملی کوشش تھی کہ فلسطین میں یہودیوں کا ایک سیاسی مرکز قائم کیا جائے۔ اس کے علاوہ بھی کئی تاریخی واقعات یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ سلطنت عثمانیہ کے دل میں یہودیوں کے لیے ایک نرم گوشہ ضرور موجود تھا لیکن جب سلطنت عثمانیہ پر برا وقت آیا تو انہی یہودیوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر ان کی سلطنت ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

انیسویں صدی میں ایک اور اہم واقعہ بھی ہوا ہے جو بہت ہی منفرد تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز اور وسط میں یہودیوں کے درمیان فلسطین واپس جانے کے خیال پر کئی کانفرنسز ہوئی تھیں۔ جن میں ایک کثیر تعداد میں یہودی عالم (ربی) بھی اکٹھے ہوتے تھے۔ ایسی ہی ایک کانفرنس 1845ء میں فرینکفرٹ میں ہوتی ہے۔ اس کانفرنس میں شریک اصلاح پسند یہودیوں نے فلسطین واپس جانے کے خیال کو رد کر دیا۔ اس کے علاوہ 1869ء میں فلاڈیلفیا میں ہونے والی کانفرنس میں بھی یہ فیصلہ کیا گیا کہ ”اب ہم خود کو ایک قوم نہیں، بلکہ ایک مذہبی طبقہ سمجھتے ہیں اس لیے ہمیں کسی بھی طرح یہودی ریاست بنانی چاہیے لیکن وہ سب

بے سود رہا۔ اس تمام بحث سے میرا یہ خیال مزید پختہ ہو گیا کہ یہودیوں کی فلسطین واپسی ایک مذہبی جذبے کے تحت نہیں بلکہ ایک سیاسی ضرورت تھی۔ کچھ تاریخ دانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ صہیونیت کا پرچار کرنے والے سیکولر یہودی تھے۔

یہودیوں کا بڑے پیمانے پر فلسطین آنے کا آغاز 1882ء میں ہوا۔ یہ بات صہیونی تحریک کے آغاز سے کئی سال پہلے کی ہے۔ اس بات سے میرے اس خیال کی تائید بھی ہوتی ہے کہ یہودیوں نے ایک طویل عرصہ دنیا سے اپنا کاروبار اور گھر چھوڑ کر ایک ویران اور کم ترقی یافتہ علاقے میں رہائش رکھنا زیادہ پسند کیا۔ آغاز میں اس کی وجہ مذہب ہی ہو سکتی ہے، کیونکہ اس وقت تک یہودیوں نے اپنے لیے الگ وطن کی جدوجہد کی تحریک شروع نہیں کی تھی۔

اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد سے اب تک 30 لاکھ سے زائد یہودی اسرائیل آکر آباد ہو چکے ہیں اور آج دنیا میں رہنے والا ہر دوسرا یہودی اسرائیل میں رہتا ہے۔

1890ء کی دہائی میں، تھیوڈور ہرزل ہی وہ شخص تھا جسے صہیونیت کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے نقل مکانی اور یہودیوں کے لیے الگ وطن کی سستی سے چلتی ہوئی تحریک کو تیز کر دیا۔ اسی کی کوششوں سے باسیل میں پہلی صہیونی کانگریس کا آغاز ہوا۔ اس موقع پر عالمی صہیونی تنظیم (ڈبلیو زیڈ او) کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی تنظیم کی کوششوں سے پہلی مرتبہ ایک منصوبے کے تحت فلسطین میں یہودیوں کی نقل مکانی کا کام تیز ہوا۔

تاریخ میں یہ بھی ملتا ہے کہ صہیونی تحریک کے آغاز میں یہودیوں نے یہ بھی سوچا کہ فلسطین سے باہر کسی مقام پر جیسے (یوگنڈا یا ارجنٹائن) میں یہودی ریاست قائم کی جائے، لیکن اس تجویز کو زیادہ پذیرائی نہیں ملی۔ البتہ فلسطین میں آبادکاری کے متعلق یہودیوں کو یکسو ہونے میں کافی وقت لگا۔ جنگِ عظیم دوم میں انگریزوں کی حمایت، سلطنت عثمانیہ کا زوال، روس میں یہودیوں پر ظلم و ستم، پولینڈ میں ان کا قتل عام، ہٹلر کا ان کے ساتھ ناقابلِ بیاں سلوک اور عربوں کی درپردہ حمایت، اپنے علم اور ہنر کی بنیاد پر امریکی حکومت پر اثر و رسوخ، مالیاتی اداروں پر کنٹرول اور سب سے بڑھ کر میڈیا پر مکمل دسترس نے مل کر صہیونیت کی تحریک کو پروان چڑھایا۔ یہ ایک طویل داستان ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جو پڑھنے کے لائق ہے کہ کس طرح یہودیوں نے مغرب میں عیش و آرام کی زندگی کو ترک کر کے ایک ویرانے میں آنا پسند کیا۔

تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک فلسطین پر عثمانی حکومت کرتے رہے اس وقت تک یہودیوں کی فلسطین آمد کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ جنگ عظیم اوّل کے بعد جیسے ہی انگریزوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا اور ساتھ ہی ان کی مرضی سے یہودیوں کی ایک بڑی تعداد نے فلسطین میں آنا شروع کر دیا تو عربوں میں ایک تشویش کی لہر پیدا ہوئی۔ عربوں نے انگریزوں کی مدد سے عثمانیوں سے اپنے عرب علاقے واپس لینے کی کوشش شروع کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے بعد ایک عرب ریاست قائم کریں گے (یعنی ابتدائی اسلامی دور کی ایک عرب سلطنت) جو کہ عربوں کا ایک دیرینہ خواب تھا۔ کئی صدیوں سے ترک ان کے علاقے پر قابض تھے اور اب وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ موقع آگیا ہے کہ وہ انگریزوں کی مدد سے ترکوں کو شکست دے سکیں۔ پھر تاریخ نے دیکھا کہ عرب انگریزوں کے ساتھی بن گئے اور ترک سلطنت کا خاتمہ ہو گیا لیکن ان کا وہ خواب ادھورا ہی رہ گیا۔

ہوا کچھ یوں کہ جب یہودی ایک کثیر تعداد میں آنا شروع ہوئے تو انھیں احساس ہوا کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ کچھ تاریخ دانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ انگریزوں نے عربوں کی مدد اسی شرط پر کی تھی کہ وہ اسرائیل کی ریاست کے قیام میں انگریزوں کی مدد کریں گے۔ یہ بات کہاں تک سچ ہے معلوم نہیں۔۔۔ اگر سچ ہے تو اس کا خمیازہ عرب ہی بھگت رہے ہیں اور اگر سچ نہیں ہے تو تب بھی یہودی اپنے مقصد میں کامیاب ہی نظر آتے ہیں۔

ہمیں تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جب یہودیوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہونا شروع ہوا تو 1936ء میں عربوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہی وہ موقع تھا جب یہودیوں نے اس بات کا احساس کیا کہ انھیں اسرائیل میں رہنے کے لیے طاقت کی ضرورت ہے۔ اسی سوچ کے تحت اسرائیل میں ایک ملیشیا فورس قائم کی گئی۔ اس کا نام "ہاگناہ" یعنی دفاع تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دفاعی نقطہ نظر سے کئی اور گروپ بھی بنائے گئے۔ اس طرح پہلی مرتبہ ایک مسلح جدّوجہد کا آغاز ہوا جو اب تک جاری ہے۔

میں نے حال ہی میں CBN کی ایک رپورٹ دیکھی جو

Virtual Israel Tour Day 45: Making Aliyah

کے نام سے 3 مئی 2020ء کو نشر کی گئی رپورٹ میں حال ہی میں امریکہ سمیت کئی مغربی ممالک سے آنے والے لوگوں (جن میں اکثریت جوان لوگوں کی تھی) سے ایک سوال کیا گیا کہ وہ اسرائیل کیوں آرہے

ہیں۔ جبکہ یہ علاقہ ایک جنگی میدان کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اکثر کا جواب یہی تھا کہ وہ اسرائیل سے محبت کرتے ہیں اور ایک یہودی ملک میں رہنا چاہتے ہیں۔ جہاں ہر طرف یہودی ہی ہوں۔

اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصّے سے آنے والے یہودیوں کو چند ماہ کے لیے ایک ہوسٹل میں رکھا جاتا ہے۔ جہاں ان کو اسرائیل میں رہنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ انھیں عبرانی زبان سکھائی جاتی ہے۔

اس رپورٹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نقل مکانی کا سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔ یہ کب تک جاری رہے گا، معلوم نہیں، لیکن جس انداز سے یہودیوں نے فلسطین کی زمین پر قبضہ کرنا شروع کیا ہوا ہے اور جس میں ہر سال اضافہ ہوتا جارہا ہے۔۔۔ اس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان کی منزل کہیں آگے ہے۔۔۔ انھیں کون روکتا ہے اور کہاں روکتا ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

اسرائیل کاقیام

اب تک کی بحث سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ اسرائیل کے قیام کا منصوبہ بڑی تیزی سے پایۂ تکمیل کی طرف گامزن تھا۔ اس میں کون کون سے مرحلے آئے، ان کا تذکرہ بے حد ضروری ہے۔

روس اور اسرائیل

یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ روس میں بھی یہودیوں پر بے حد ظلم و ستم کیے گئے۔ 1941ء میں جنگ عظیم دوم کے دوران جرمنی نے روس پر حملہ کیا۔ اس موقع پر اسٹالن نے یہودیوں کی حمایت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کام کے لیے اس نے یہودیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی بھی بنائی گئی اور ہزاروں یہودی جرمنی سے فرار ہو کر روس میں داخل ہو گئے۔ روس نے انھیں خوش آمدید بھی کہا اور ہر طرح کی آزادی بھی دی۔ یہودیوں نے بھی جنگ میں روس کا ساتھ دیا جس کے بدلے میں اسٹالن نے انھیں اسرائیل کے قیام میں مدد فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اسرائیل کے قیام کے لیے اقوام متحدہ میں پیش کی گئی قرارداد کو روس کی حمایت بھی حاصل ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اسرائیل کے قیام کے بعد روس نے عربوں کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ اس کی وجہ سے عرب دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے۔ اہل فلسطین، شام، عراق اور لیبیا کے ساتھ ساتھ کئی عرب ممالک بھی روس کے کیمپ میں چلے گئے۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ روس نے امریکہ کی مخالفت میں فلسطین کی حمایت اور اسرائیل کی مخالفت کی۔ روس نے یہ سب اس لیے بھی کیا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عرب میں امریکہ اور برطانیہ کی بالادستی قائم ہو۔

اقوام متحدہ اور اسرائیل

میں نے پچھلے صفحات میں اس موضوع پر بات کی ہے کہ کس طرح جنگ عظیم اوّل اور دوم میں یہودیوں نے انگریزوں اور روسیوں کی مدد کی جس کے نتیجے میں انھوں نے ان کے لیے ایک الگ وطن کی کوششوں میں تعاون کا وعدہ کیا۔ اسی وعدے کی پاسداری کی خاطر برطانیہ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے منعقدہ اجلاس میں 15 مئی 1947ء کو ایک درخواست پیش کی جس میں کہا گیا کہ یہودیوں کو ایک الگ وطن کی اجازت دی جائے۔ ایک سیر حاصل بحث کے بعد اس مسئلے کے حل کی تلاش کے لیے ایک خصوصی کمیٹی UN Special Committee on Palestine (UNSCOP) تشکیل دی گئی۔ جس سے یہ کہا گیا کہ وہ اس مسئلے پر اپنی سفارشات پیش کرے۔ یاد رہے اس کمیٹی میں گیارہ ممالک (آسٹریلیا، کینیڈا، چیکوسلاواکیا، گوئٹے مالا، ہندوستان، ایران، نیدرلینڈز، پیرو، سویڈن، یوروگوئے اور یوگوسلاویہ) کے نمائندے تھے۔ اس فہرست میں ایک مسلمان ملک ایران بھی تھا جو اس وقت انگریزوں، روسیوں اور امریکیوں کا اہم اور بااعتماد حامی تھا۔ اس فہرست میں ان میں سے کوئی بھی نہ تھا جن کے متعلق فیصلہ ہونے جا رہا تھا۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ فلسطین کو تقسیم کر کے ایک آزاد عرب ریاست، ایک یہودی ریاست اور یروشلم کو ایک انٹرنیشنل شہر بنایا جائے۔ اس تجویز کو فلسطینی عربوں اور عرب لیگ کے ممبران نے کلی طور پر مسترد کر دیا، لیکن کمزور کی کون سنتا ہے۔

پھر ایک دن آیا جب 29 نومبر 1947ء کو (فلسطینی عربوں کے قرار داد مسترد کرنے کے باوجود اور عرب لیگ کے تمام ممبروں کا اسکے خلاف ووٹ دیئے) تقسیم فلسطین اور قیامِ اسرائیل کی قرار داد منظور کر لی گئی اور ایک قضیے کی بنیاد رکھی جو پچھلے ستر سال سے ایک جنگ کا روپ لیے ہوئے ہے۔

اس طرح دو ہزار سال پہلے فلسطین سے نکالے گئے یہودی ایک دفعہ پھر اپنے آبائی علاقے میں اسرائیل کے نام سے ایک ریاست بنانے میں کامیاب ہو گئے، لیکن جیسا یہودیوں اور ان کے حواریوں نے سوچا تھا اس کے اُلٹ ہوا۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنا بے حد ضروری ہے کہ جنگ عظیم اوّل میں عرب اور یہودی دونوں ہی اتحادیوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ عربوں کا مقصد ترکوں سے آزادی حاصل کر کے اپنی ریاستیں قائم کرنا

تھا۔ جنگ عظیم اوّل میں عربوں نے ترکوں سے تو آزادی حاصل کر لی اب اتحادیوں سے آزادی حاصل کرنا باقی تھی (جبکہ یہودیوں کا مقصد فلسطین کے اندر الگ ملک کے قیام کے لیے مدد حاصل کرنا تھا)۔

تاریخ میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ انگریزوں نے دونوں کے ساتھ ہی وعدے کیے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ روس نے بھی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے یہودیوں کو اپنے ہاں سہولتیں دیں اور جرمنی سے آنے والے یہودی پناہ گزینوں کو پناہ بھی دی۔ روس نے جنگ کے دوران یہودیوں سے مدد بھی مانگی اور اس کے بدلے انھیں اسرائیل کے قیام میں مدد فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا اور انھوں نے ایسا کیا بھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز سے ہی امریکہ براہ راست اس میں شریک نہیں تھا لیکن بعد میں جب جاپان نے اس پر ایک حملہ کیا تو وہ بھی شریک ہو گیا اور دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ اسی کے پھینکے ہوئے ایٹم بموں سے ہوا۔

یہودی، جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے اور جن کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی تو وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے روس، برطانیہ، امریکہ، فرانس سب ان کی مدد حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب بہت تفصیل سے دیا جا سکتا ہے۔

میں مختصر طور پر صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہودیوں کو یہ معلوم تھا کہ ان کی تعداد بہت کم ہے اس لیے انھوں نے دو میدانوں کے اندر اپنا لوہا منوایا ایک علم اور (ایٹم بم بنانے میں بھی ایک یہودی کا اہم کردار ہے) دوسرا معیشت، اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف اہم ترین نشریاتی اداروں کا کنٹرول بھی انھیں کے پاس تھا۔

اس لیے جب جنگ عظیم دوم ختم ہوئی اور انگریزوں نے وعدے نبھانے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے عربوں کے علاقے عربوں کے سپرد کر دیئے (جیسے شام، عراق، سعودی عرب، لبنان، اردن وغیرہ) لیکن فلسطین کی تقسیم کر کے ایک حصّہ یہودیوں اور ایک عربوں کو دے دیا۔ عرب در حقیقت ایسا نہیں چاہتے تھے۔

یہاں پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا عربوں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہودی اس جنگ میں اتحادیوں کا ساتھ اسی بنیاد پر دے رہے ہیں کہ انھیں ان کا وطن دلوایا جائے گا اور فلسطین کو تقسیم کیا جائے گا؟ اب تک جو میں نے پڑھا ہے اس کے مطابق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات ان کے علم میں تھی لیکن وہ ہر

قیمت پر ترکوں سے مکمل آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھے، جس کی ایک شکل فلسطین کی تقسیم تھی۔ عربوں کے بیشتر علاقوں میں عرب ہی رہتے تھے اس لیے انھیں یہ یقین تھا کہ ان علاقوں میں عربوں کو ہی حکمران بنایا جائے گا اور اس بات کا بھی علم تھا کہ فلسطین کا کچھ حصّہ یہودیوں کو بھی دیا جائے گا۔

میں اس بات میں صرف اتنا اضافہ کروں گا جن سے عرب ممالک کی حکمرانی کا وعدہ کیا گیا تھا اور وہ بادشاہ بننے والے تھے انھیں سب معلوم تھا۔ انھیں صرف علم ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس منصوبہ کا حصّہ بھی تھے، لیکن عوام ان سے مختلف سوچتے تھے۔ اس لیے جیسے ہی فلسطین کی تقسیم ہوئی تو عوام اس کے خلاف کھڑی ہو گئی۔ اگر آپ 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ دیکھیں تو بہت کم عرب ریاستیں اس جنگ میں حصّہ لیتی دکھائی دیں گی۔ نہتے عربوں نے ہی جنگ میں جانیں قربان کیں۔ اس وقت اسرائیل ریاست کو قائم ہوئے صرف چند ماہ ہی ہوئے تھے ان کی باقاعدہ فوج بھی نہیں تھی۔ عرب اگر مل کر سوچتے تو نتیجہ مختلف ہو سکتا تھا۔ اس جنگ کا کیا انجام ہوا اس پر ہم اگلے صفحات میں بات کریں گے۔

شاید یہ بات بہت سے لوگوں کو اچھی نہ لگے لیکن میں نے اب تک جو پڑھا، اس بناء پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تقسیم فلسطینی عرب حکمرانوں کی مرضی سے ہوئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ تقسیم کے وقت اسرائیل کو تھوڑا حصّہ دیا گیا اور بعد میں اس نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر ایک بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ انھیں اس بات کا علم تھا کہ بڑے علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے تین چیزوں کی بہت ضرورت ہے؛ افرادی قوت، معاشی طاقت اور اس کے ساتھ ساتھ مقبوضہ علاقہ۔

انھوں نے ہر جائز اور ناجائز طریقہ اختیار کر کے فلسطین کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ غریب عربوں سے زمین کی خریداری بھی ایک حربہ تھا جو وسیع پیمانے پر آزمایا گیا۔

پہلی عرب اسرائیل جنگ کے وقت اسرائیل کے پاس افرادی قوت بھی تھی اور ایک مخصوص علاقہ بھی تھا اور یوں ایک ملک (جسے کہا گیا تھا کہ تمہارا فلسطین میں پچاس فیصد کے قریب حصّہ ہوگا) فلسطین کے ستر فیصد سے زائد ایک بڑے حصّے پر قابض ہے اور فلسطینی سمٹ کر غزہ کی پٹی اور ویسٹ بنک تک محدود ہو گئے ہیں۔ یہ سب ممکن نہیں تھا اگر یہودیوں کا پختہ عزم، ان کی یکسوئی، اس کام کے لیے جدّوجہد، مغرب کی ہر طرح کی مدد، ان کی معاشی طاقت، علمی برتری اور ابلاغ پر قبضہ نہ ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُمت مسلمہ خاص طور پر عرب قیادت کی بے حسی بھی ان حالات کی ذمہ دار ہے۔



The UN votes on partition, November 29, 1947
https://www.timesofisrael.com



First World War
Photo Credit: https://www.agreena.com



Jews Arrival in Israel Photo Credit: https://en.wikipedia.org

عرب اسرائیل پہلی جنگ 1948

کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تقسیم فلسطین کے نتیجے میں اس خطے میں ایک جنگ کا آغاز ہو جائے گا۔ یہ سب کیسے ہوا اور اس دوران کیا کیا اہم واقعات پیش آئے، اس کا ایک مختصر تذکرہ پیش خدمت ہے۔

29 نومبر 1947ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں فلسطین کے برطانوی مینڈیٹ کو دو ریاستوں (ایک عرب اور ایک یہودی) اور یروشلم شہر میں تقسیم کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد کی سفارش کی گئی۔

جیسے ہی 29 نومبر 1947ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور کی گئی تو یہودیوں میں زبردست خوشی کی لہر دوڑ گئی اور عرب دنیا میں ایک بڑے پیمانے پر غم و غصے کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ یاد رہے اس وقت تک اسرائیل میں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر عرب ممالک میں بھی یہودی آباد تھے۔ (یاد رہے 1947 میں ہی ہندوستان کی تقسیم کا اعلان بھی ہوا تھا)۔

تقسیم فلسطین کے اعلان کے فوری بعد فلسطین کے مختلف علاقوں میں پر تشدد ہنگامے شروع ہو گئے۔ ایک طرف یہودی تھے اور دوسری طرف وہ عرب جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی لیکن ان کے ساتھ عیسائی بھی بڑی تعداد میں شریک تھے۔ اس موقع پر برطانیہ نے غیر جانبداری کا کردار اپنایا اور خانہ جنگی کو بڑھنے سے نہ روکا۔ بالکل اسی طرح جیسے انھوں نے تقسیم ہند کے وقت پنجاب میں ہونے والی خانہ جنگی کو نہیں روکا۔

عربوں میں زبردست جوش و خروش پیدا ہوا۔ کئی اطراف سے عرب مجاہدین فلسطین آنا شروع ہو گئے۔ اس جنگ کی تفصیلات بہت ہی ہولناک ہیں۔ ایک طرف یہودیوں کے گروہ تھے۔ (ابھی اسرائیل کی باقاعدہ فوج نہیں تھی)۔ عرب بھی مختلف گروہوں کی شکل میں لڑ رہے تھے۔ اس تمام صورت حال میں یہودی ایک مشکل صورت حال میں گرفتار ہو گئے۔

یوں تو اس جنگ کے کئی سرکردہ لوگوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک شخصیت

عبد القادر الحسینی تھے جو کئی سو مجاہدین کے ساتھ مصر سے آئے تھے اور انھوں نے مقامی طور پر بھی کئی ہزار رضاکاروں کو بھرتی کیا۔ ان سب کی مدد سے انھوں نے یروشلم میں موجود ایک لاکھ یہودی باشندوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہودیوں کے کئی جنگجو گروہوں نے (جن میں ایک اہم ترین گروہ ہاگنہ)انکا بھرپور مقابلہ کیا، لیکن عبد القادر الحسینی نے انھیں بے حد نقصان پہنچایا۔

عرب لیگ اور اس کا کردار

اس سے قبل کہ میں آپ کو عرب اسرائیل کی پہلی جنگ سے متعلق کچھ معلومات فراہم کروں میں چاہوں گا کہ وہ تنظیم جس نے اس جنگ کو شروع کیا (یعنی عرب لیگ ہے) اس کا مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

یاد رہے کہ جنگ عظیم اوّل کے خاتمے کے بعد اس علاقے میں کئی عرب ریاستیں معرضِ وجود میں آچکی تھیں جبکہ فلسطین پر ابھی تک انگریزوں کا قبضہ تھا۔ عربی بولنے والی افریقی اور ایشیائی ریاستوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر عرب لیگ (جسے الجامعۃالعربیہ کا نام بھی دیا گیا) اس کی بنیاد 1945ء قاہرہ میں رکھی گئی تھی۔ابتداء میں چھ ممالک اس کے ممبر تھے اور اب ان کی تعداد 22 ہے۔اس لیگ کا بنیادی مقصد عرب دنیاکے قومی معاملات کو بہتر انداز میں پیش کرنا ہے۔

عرب لبریشن آرمی (ALA)

جب فلسطین کی تقسیم کی گئی تو اسی عرب لیگ نے عرب لبریشن آرمی (ALA) بنائی جس نے اسرائیل کے خلاف جنگ کی۔ (میں اس جنگ کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ اس میں کافی ایسی باتیں جاننے کو ملیں جن کا ذکر منفی اثرات پیدا کر سکتا ہے)۔ بہر حال یہ بات بڑی اہم ہے کہ جیسے ہی فلسطین پر انگریزوں کا حق حکمرانی (14 مئی 1948ء کو آدھی رات کو) ختم ہوااس کے دوسرے دن ہی 15 مئی کی صبح کو عرب فوج فلسطین کے علاقے میں داخل ہو گئی۔

آغاز میں یہ جنگ ایک خانہ جنگی کی صورت میں شروع ہوئی لیکن جلد ہی اس نے پورے خطّے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ جنگ کئی ماہ تک چلتی رہی اور زیادہ تر فلسطین، جزیرہ نما سینا اور جنوبی لبنان کی سر زمین پر لڑی گئی۔

جنگ کے نتیجے میں اسرائیل نے اُس تمام علاقے پر قبضہ کر لیا جو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قرارداد میں منقول تھا۔ اس طرح پہلی مرتبہ اسرائیل فلسطین کے تقریباً 60 فیصد علاقے پر قابض ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ علاقے اردن کے پاس چلے گئے۔ اسی دوران مصری فوج نے غزہ کی پٹی پر قبضہ کر لیا۔ یاد رہے فلسطین کے لوگوں نے ایک دفعہ یہ مطالبہ بھی کیا کہ انھیں ٹرانس جورڈن (یہ دریائے اردن کے مشرقی کنارے کا وہ علاقہ تھا جس پر برطانیہ اور اردن کے شاہی خاندان کی حکومت تھی) کے ساتھ ملا کر ایک آزاد عرب ریاست کا درجہ دے دیا جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جنگ کے نتیجے میں فلسطین کے علاقے میں سات لاکھ فلسطینی اپنے گھروں سے بے دخل کر دیئے گئے اور وہ فلسطینی پناہ گزین بن گئے جو اب تک پناہ گزین ہی ہیں۔ جنگ اور جنگ کے بعد صرف تین سالوں میں دس لاکھ کے قریب یہودی اسرائیل میں آبسے۔

جنگ کا یہ انجام کیوں ہوا؟ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جیسے مناسب فوج کا نہ ہونا، جنگی سامان کی کمی وغیرہ وغیرہ۔۔۔

میں نے اب تک جو پڑھا اس کے مطابق سب سے بڑی وجہ عربوں کی باہمی کشمکش تھی۔۔۔ باقی اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

مختصر یہ کہ جنوری 1948ء کو عرب لبریشن آرمی نے فلسطین میں قدم رکھا جس کی اسرائیل نے سخت مزاحمت کی۔ اس جنگ میں کئی مرتبہ جنگ بندی کا موقع بھی آیا۔ اسرائیل کی ائیر فورس نے بھی اس میں حصّہ لیا، لیکن آخر کار عرب لبریشن آرمی کامیاب نہ ہو سکی۔

بریگیڈئیر ضیاء الحق اور فلسطینی مہاجر

اس موقع پر میں ایک اور بات بھی آپ کو یاد دلوانا چاہتا ہوں کہ ہم نے اکثر سنا ہے کہ جب جنرل ضیاء الحق بریگیڈئیر تھے تو انھیں پاکستان کی طرف سے اردن بھیجا گیا تھا اور وہاں پر انھوں نے فلسطینی لوگوں کے خلاف جنگ کی تھی۔

اس کی تفصیل بھی بہت افسوسناک ہے۔ جس کا مختصر احوال یہ ہے کہ پہلی عرب اسرائیل جنگ اور دوسری چھ روزہ جنگ کے نتیجے میں بہت بڑی تعداد میں فلسطینی اردن میں آکر پناہ گزین بن گئے۔ شروع میں تو کوئی مسئلہ نہ بنا لیکن جلد ہی شام، ایران اور پی ایل او (جس کے سربراہ یاسر عرفات تھے) نے اردن کے شاہی خاندان کے لیے مسائل پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ جسے ختم کرنے کے لیے اردن کے بادشاہ نے پاکستان سے درخواست کی اس سلسلے میں ضیاء الحق کئی سال تک پاک فوج کے دستے کے ساتھ اردن میں رہے۔

یاسر عرفات کا دعویٰ ہے اس دوران پچیس ہزار فلسطینیوں کو قتل کیا گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تعداد تین ہزار کے قریب تھی۔ کسی ایک بے گناہ کا قتل بھی پوری انسانیت کے قتل کے برابر ہے۔

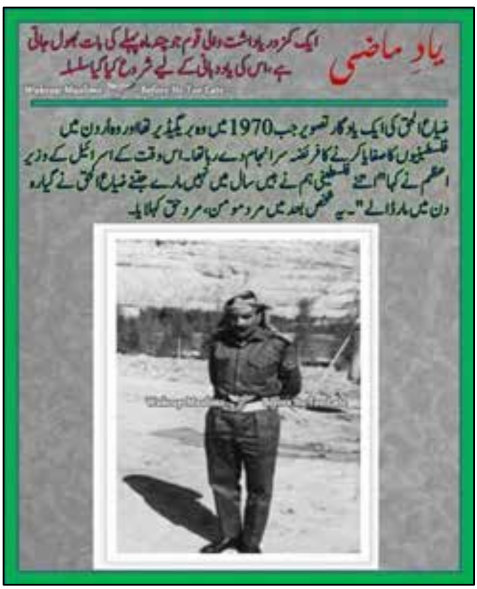
اس لیے مجھے اب تک یاد ہے کہ جب میں ٹیکسٹائل کالج میں پڑھتا تھا تو اس وقت ہمارے ساتھ فلسطین کے لڑکے بھی تھے۔ جو اس بات کا تذکرہ کرتے تھے کہ آپ کی فوج نے ہمیں بے حد نقصان پہنچایا تھا۔

یہ ایک افسوسناک کہانی ہے۔ مجھے ایک صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اب تک ان فلسطینی مہاجرین کو کوئی بھی عرب ملک نیشنلٹی نہیں دیتا اور یہ جہاں بھی رہتے ہیں مہاجرین کی صورت میں ہی رہتے ہیں۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ان کے حال پر رحم کرے اور یہ بھی کبھی اپنے گھروں میں سکون سے رہ سکیں۔ (آمین)



Arab Isrel First War 1948 Photo Credit: https://www.timesofisrael.com



Brig Zia-ul- Haq in Jordan Photo Credit: https://lubpak.net

دنیا بھر میں یہود آبادی

2019ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق ایسے لوگوں کی تعداد جو اپنی شناخت ایک یہودی کی حیثیت سے کرواتے ہیں، ان کی دنیا بھر میں تعداد 14.7 ملین ہے جو کہ دنیا کی کل آبادی کا صرف 0.2 فیصد ہے۔ انھیں (Core Jews) کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے والدین میں سے ایک یہودی تھا انھیں (Connected Jews) کہا جاتا ہے۔ ایسے یہودیوں کی تعداد 17.9 ملین بنتی ہیں۔ ایک تیسری طرح کے یہودی بھی ہیں جن کو (Enalrged Jews) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا یہودی پس منظر ہے لیکن یہودی والدین نہیں ہیں اور ایسے لوگ یہودی لوگوں سے ملتے ملاتے رہتے ہیں اور ان سے متاثر بھی تھے۔ ان کی آبادی 20.9 ملین ہے۔ اس طرح اگر ہم دیکھیں تو ہر طرح کے یہودیوں کو ملا کر ان کی مجموعی تعداد پچاس ملین سے زائد ہے جو کہ دنیا کی کل آبادی 0.6 فیصد ہے۔

اس وقت اسرائیل کی کل آبادی 9.3 ملین ہے جن میں بیس فیصد (یعنی تقریباً اٹھارہ لاکھ) مسلمان ہیں۔

یاد رہے اسرائیل کے قیام کے وقت اسرائیل کی آبادی ایک ملین کے قریب تھی۔ شاید ہی کسی ملک کی آبادی میں اس قدر تیزی سے اضافہ ہوا ہو۔ تاریخ ایسی مثال دینے سے قاصر ہے۔ یہ سلسلہ ابھی رُکا نہیں، ابھی بھی ہر سال لاکھوں یہودی یہاں آکر آباد ہو رہے ہیں اور جو اضافہ نئے پیدا ہونے والے بچّوں کی وجہ سے ہو رہا ہے وہ الگ ہے۔ جو بھی یہودی یہاں آتا ہے وہ واپس نہیں جاتا۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ آنے والے چند سالوں میں یہودیوں کی آبادی نوے فیصد سے بھی زائد ہو جائے جو ابھی اسّی فیصد کے قریب ہے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو تقسیم فلسطین کے بعد کی تاریخ اور اسرائیل کے قیام کے دوران ہونے والے واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ اسرائیل اور فلسطین کی موجودہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال سے بھی آپ کو آگاہ کروں۔ یہ یقیناً آپ کو پورا مسئلہ سمجھنے میں مدد دے گا۔

فلسطین: معاشی و معاشرتی صورتِ حال

موجودہ فلسطین اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کے مطابق ایک آزاد مملکت ہے۔ جو مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں واقع ہے۔ اس کا صدر مقام یروشلم ہے لیکن یروشلم کے کچھ حصّے پر اسرائیل کا بھی دعویٰ ہے۔ عملی طور پر رملہ فلسطین کا دارالحکومت ہے۔ اسرائیل کے معرض وجود میں آنے سے قبل یہ سارا علاقہ فلسطین کہلاتا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد اس پر انگریزوں نے قبضہ کیا اور بعد میں اردن اور مصر بھی اس پر قابض رہے۔ پھر ایک معاہدے کے تحت فلسطین کا کچھ حصّہ اسرائیل کی شکل میں سامنے آیا۔

اس وقت فلسطین دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصّہ مشرق میں ہے جسے ویسٹ بنک کہا جاتا ہے یہ بحیرہ مردار اور دریائے اردن کے کنارے پر واقع ہے۔ دوسرا حصہ ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر (غزہ کی پٹی کی صورت میں) مغرب میں بحیرہ روم کے کنارے واقع ہے جس کی جنوبی سرحد مصر اور شمال اور مشرق میں اسرائیل سے ملتی ہے۔ ویسٹ بنک کی سرحد مشرق میں اردن جبکہ شمال، جنوب اور مغرب میں اسرائیل سے ملتی ہے۔ اس طرح سے فلسطین دو الگ الگ حصوّں پر مشتمل ایک ملک ہے جس کی سرحدیں آپس میں نہیں ملتیں۔

اوسلو معاہدے کے مطابق مغربی کنارے میں واقع علاقے کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کا اٹھارہ فیصد حصّہ فلسطینی حکومت کے زیر انتظام ہے جبکہ بائیس فیصد حصّہ مشترکہ طور پر اسرائیل اور فلسطینی حکومت کے کنٹرول میں ہے۔ جبکہ ساٹھ فیصد حصّہ (مشرقی یروشلم کے سوا) اسرائیلی سول انتظامیہ کے زیر انتظام ہے۔ ان علاقوں میں آنے جانے کے لیے کئی قوانین بنائے گئے ہیں۔ جن میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہیں۔

فلسطین کی حکومت میں فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او) کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ تنظیم ریاست فلسطین کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ پی ایل او مختلف بین الاقوامی تنظیموں میں بھی شامل ہوتی ہے۔ (اس کے بارے میں تفصیل اگلے صفحات میں بیان کی جائے گی)۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ 15 دسمبر 1988ء کو جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعے باقاعدہ طور پر فلسطین کو تسلیم کیا تھا۔ اقوام متحدہ کے 193 ممبر ممالک میں سے اب تک 138 ممالک

ریاست فلسطین کو تسلیم کر چکے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو ریاست فلسطین کو تسلیم نہیں کرتے مگر پی ایل او کو "فلسطینی عوام کا نمائندہ" تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ایک گنجلک سا نظام ہے جسے سمجھنا کافی مشکل ہے۔

آج سے پانچ سال قبل 23 دسمبر 2015ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ اسرائیل کے زیر قبضہ فلسطینی علاقوں میں موجود قدرتی وسائل پر فلسطینیوں کا حق ہے۔ اس قرارداد کو 164 ملکوں کی حمایت حاصل تھی جبکہ پانچ ملکوں نے اس کی مخالفت کی۔

فلسطین کی قانونی حیثیت کے بارے میں کئی سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ کئی ممالک اسے ایک متنازعہ علاقہ گردانتے ہیں اور کئی ایسے ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ دو طرفہ سفارتی تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ البتہ ایک بات ضرور نظر آتی ہے کہ ویسٹ بنک اور غزہ کی پٹی کے علاقے میں فلسطین کی حکومت کو محدود اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن وہاں بھی بہت سے معاملات میں اسے اسرائیل پر ہی بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جس کی سرحد ہر سال سکڑتی جاتی ہے، نئی یہودی بستیاں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

موجودہ اعداد و شمار کے مطابق ریاست فلسطین کی آبادی پچاس لاکھ کے قریب ہے اور اس کا رقبہ چھ ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ اس کا شمار دنیا کے گنجان آباد ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔

فلسطین میں خواندگی کی شرح 96.3 فیصد سے بھی زائد ہے۔ فلسطین میں مسلمان آبادی 93 فیصد جبکہ چھ فیصد کے قریب عیسائی آباد ہیں۔ دیگر مذاہب کے ماننے والے تقریباً ایک فیصد ہیں۔ اسرائیل کی طرف سے ویزے کی کافی سختی کی جاتی ہے۔ بہت سے مسلمان ممالک کے لوگوں کو اسرائیل جانے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ فلسطین جانے کے لیے ویزے کی زیادہ سختی نہیں ہے۔

البتہ یو این او میں یہ بطور مبصر شریک ہوتا ہے۔ اس کا بھی یہ کہنا ہے کہ یروشلم اس کا صدر مقام ہے لیکن عملاً اس کے تمام دفاتر رملہ میں ہیں جو کہ یروشلم سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ فلسطین کی سرکاری زبان عربی ہے۔ اس کا سیاسی نظام کسی حد تک صدارتی ہے اس وقت اس کے صدر محمود عباس ہیں اور وزیراعظم کا نام محمد Shtayyeh ہے۔ قانون ساز ادارے کا نام نیشنل کونسل ہے۔

یوں تو فلسطین صدیوں سے قائم ایک ملک ہے لیکن 15 نومبر 1988ء کو اس کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا گیا اور 2012ء میں یو این او میں بطور مبصر آجانے کی اجازت دی گئی۔ یہ بھی ایک بدقسمتی ہے کہ ابھی تک فلسطین کو ایک مکمل خود مختار ریاست کا درجہ نہیں مل سکا۔

فلسطین کا کل رقبہ 6 ہزار مربع کلومیٹر جس میں غزہ کی پٹی کا رقبہ 365 کلومیٹر ہے جہاں اب 20 لاکھ لوگ آباد ہیں جبکہ ویسٹ بنک کا رقبہ ساڑھے پانچ ہزار مربع کلومیٹر ہے جس میں 30 لاکھ لوگ رہائش پذیر ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق فلسطین کا جی ڈی پی 26 بلین ڈالر اور فی کس آمدنی چھ ہزار ڈالر ہے۔ (پاکستان میں فی کس آمدن پانچ ہزار ڈالر ہے)۔ فلسطین میں شرح خواندگی 90 فیصد سے بھی زائد ہے۔

اگر حالات ٹھیک ہوں تو ہر سال چالیس سے پچاس لاکھ لوگ فلسطین میں سیاحت کے لیے آتے ہیں یہاں پانی جیسے تمام تر معاملات پر اسرائیل کا کنٹرول ہے۔ انہی کی مرضی سے فلسطینیوں کو زندگی کی ضروریات ملتی ہیں۔

اسرائیل کاایک مختصر تعارف

اسرائیل مغربی ایشیاء میں بحیرہ روم کے جنوب مشرقی کنارے اور بحر احمر کے شمالی کنارے پر واقع ہے۔ اس کی سرحد شمال میں لبنان ، شمال مشرق میں شام ، مشرق میں اردن ، مغربی کنارے کے فلسطینی علاقوں اور غزہ کی پٹی کے ساتھ ملتی ہے۔ تل ابیب ملک کا معاشی اور سیاسی مرکز ہے۔ اسرائیل کے اعلان کے مطابق دارالحکومت یروشلم ہے لیکن عملاً ایسا نہیں ہے اور اس کے لیے کئی بار کوشش بھی کی گئی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ یروشلم کے مغربی حصّے پر اسرائیل قابض ہے۔

1920ء سے 1948ء تک اس سرزمین پر انگریزوں کا قبضہ رہا۔ اقوام متحدہ نے اسے 1947ء میں ایک الگ ملک بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے مطابق دو ریاستوں کا قیام اور یروشلم کو ایک بین الاقوامی شہر کے طور پر رکھے جانے کی تجویز پیش کی گئی۔ جسے یہودیوں نے قبول کیا لیکن عرب اس کے حق میں نہیں تھے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں 1948ء میں عرب اسرائیل جنگ ہوئی۔ اسرائیل نے اس کے بعد سے اب تک عرب ممالک کے ساتھ متعدد جنگیں لڑیں۔ آخری جنگ 1967ء میں ہوئی جسے چھ روزہ جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگ کے بعد بھی کئی جنگیں اور کئی معاہدے ہوئے جن میں کیمپ ڈیوڈ معاہدہ بھی شامل ہے۔ اوسلو معاہدہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود امن دور دور تک نظر نہیں آتا۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اسرائیل ایک یہودی اور جمہوری ریاست ہے۔ اس میں ایک پارلیمانی نظام رائج ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔ یہاں یہودی مذہب کے ماننے والے 75 فیصد، مسلمان آبادی کا اٹھارہ فیصد جبکہ دو فیصد عیسائی ہیں۔ باقی لوگوں کا تعلق دیگر مذاہب سے ہے۔

جی ڈی پی کے لحاظ سے اسرائیل دنیا کی 31 ویں سب سے بڑی معیشت ہے۔ یہاں بسنے والے ساٹھ فیصد سے زائد لوگ فوجی تربیت یافتہ ہیں

تل ابیب، یروشلم، بیر شیبہ اور حائفہ اسرائیل کے چار بڑے شہر ہیں۔ اس کے علاوہ ہر سال نئی یہودی بستیاں بسائی جارہی ہیں اور دنیا بھر سے یہودی لوگوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

اسرائیل کی سرکاری زبان عبرانی ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک سرکاری زبان عربی تھی۔ اب

اس کا درجہ کم کر دیا گیا ہے۔ عربی اب اقلیت کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ یاد رہے انگریزوں کے دور میں سرکاری زبان انگریزی تھی۔ البتہ انگریزی کی عالمی حیثیت کی وجہ سے ایک عام اسرائیلی بھی انگریزی بول لیتا ہے۔ فلسطین کی سرکاری زبان عربی ہے۔

اسرائیل میں پارلیمانی نظام ہے۔ چند روز قبل جب میں نے یہ تحریر لکھنا شروع کی تو اس وقت نیتن یاہو وزیر اعظم تھے۔ وہ پچھلے بارہ سال سے بر سر اقتدار ہیں۔ انھوں نے ہی جنگِ رمضان میں فلسطین پر بے شمار ظلم ڈھائے تھے۔ جنگ بندی کے چند دن بعد ہی ان کے خلاف ایک سیاسی محاذ بنا اور 13 جون 2021ء کو Naftali Bennett کو اسرائیل کا نیا وزیر اعظم منتخب کر لیا گیا ہے۔

اسرائیل کا جی ڈی پی 372 بلین ڈالر ہے (پاکستان کا جی ڈی پی 272 بلین ڈالر ہے)۔ اس کی فی کس آمدنی چالیس ہزار ڈالر سے بھی زائد ہے۔ اسرائیل میں شرح خواندگی 98 فیصد اور ایک ریسرچ کے مطابق دنیا میں اسرائیل کا شمار بھی پہلے چند ممالک میں ہی ہوتا ہے۔

اس وقت یو این او کے 192 ممالک میں سے 164 ممالک کے ساتھ اسرائیل کے اچھے سفارتی تعلقات ہیں۔ حال ہی میں چند مسلمان ممالک (جن میں بحرین، یو اے ای، سوڈان اور مراکش شامل ہیں) نے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کیے ہیں۔ کسی دور میں ایران کے بھی اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات تھے جو کہ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد ختم ہو گئے۔

اسرائیل کی فوج ہر طرح کے ہتھیاروں سے مسلح ہے۔ ہر اسرائیلی شہری پر فوجی تربیت حاصل کرنا لازم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ اسرائیل ایک ایٹمی طاقت بھی ہے۔ وہ اپنی آمدن کا ایک بہت بڑا حصّہ ہتھیاروں کی خریداری پر خرچ کرتا ہے۔ ٹیکنالوجی کی دنیا میں یہ ان چند ممالک میں شامل ہے جنھوں نے ٹیکنالوجی کے میدان میں بے شمار ترقی کی۔ ہر سال چالیس لاکھ سے زائد لوگ اسرائیل میں سیاحت کی غرض سے آتے ہیں۔

فلسطینی مزاحمتی تنظیمیں

اسرائیل کے مقابلے کے لیے فلسطینیوں نے کئی تنظیمیں بھی بنائیں۔ جن میں سے تین تنظیمیں کافی مشہور ہوئیں۔ ان کے نام کچھ اس طرح سے ہیں: فلسطین لبریشن آرگنائزیشن (پی ایل او)، فتح اور حماس۔ ان تینوں کا ایک مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

حماس: ایک اسلام پسند تنظیم

حماس جس کا عربی میں پورا نام ''حرکۃ المقاومۃ الاسلامیۃ'' ہے، اس کا مخفف حماس بنتا ہے۔ اسے انگلش میں Islamic Resistance Movement بھی کہا جاتا ہے۔

بنیادی طور پر یہ تنظیم مصر کی ایک بہت بڑی جماعت اخوان المسلمین سے وابستہ لوگوں نے 1987 میں بنائی۔ یاد رہے اخوان المسلمین 1950 سے ہی غزہ میں کام کر رہی تھی۔ انھوں نے وہاں پر بے شمار مساجد بنائیں اور کئی فلاحی ادارے بھی قائم کیے اور بعد میں سیاست میں بھی حصّہ لینا شروع کر دیا۔ اس وقت اس علاقے میں پی ایل او کا زور تھا۔ پہلی مرتبہ پی ایل او کو ایک سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

2006ء میں ہونے والے الیکشن میں حماس نے اکثریت حاصل کرکے برسرِ اقتدار پارٹی "فتح" کو شکست دی۔ بعد ازاں دونوں کے درمیان اختلافات بڑھ گئے اور ایک جنگی کیفیت بھی پیدا ہو گئی۔ یہ ایک ناپسندیدہ صورتحال تھی۔ حماس نے غزہ میں اپنا کنٹرول مضبوط کر لیا جبکہ ویسٹ بنک میں پی ایل او سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اکثریت ہو گئی۔ یہ بات جاننا بھی ضروری ہے کہ جب مصر میں اخوان المسلمین پر برا وقت آیا تو مصر نے اسرائیل کے ساتھ مل کر غزہ کا محاصرہ کیا۔ وہ ایک طرح سے معاشی بائیکاٹ بھی تھا۔ جب محاصرہ طول پکڑ گیا تو حماس نے اسرائیل پر راکٹ برسانے شروع کر دیئے۔ جس کے نتیجہ میں محاصرہ ختم کر دیا گیا۔ اس تنظیم کی بنیاد رکھنے والوں میں سب سے اہم نام شیخ احمد یاسین کا ہے جو معذوری کی حالت میں بھی فلسطینیوں کی قیادت کر رہے تھے۔ ایک دن اسرائیل نے انھیں ٹارگٹ کرکے شہید کر دیا۔

حالیہ جنگِ رمضان میں بھی حماس نے ہی اسرائیل پر راکٹ برسائے۔ اس وقت دنیا کے بہت سے ممالک حماس کو ایک شدت پسند تنظیم کے طور پر دیکھتے ہیں اور اس پر پابندی بھی لگا رکھی ہے۔ حماس کے ساتھ کسی بھی طرح کے تعلق رکھنے والے شخص کو معاف نہیں کیا جاتا۔ اس وقت اس کے سربراہ اِسماعیل

عبد السلام احمد ہنیتہ ہیں۔ اس تنظیم کا اصل گڑھ غزہ کی پٹی ہے۔ حالیہ جنگ میں حماس کے کئی اہم رہنما بھی شہید ہوئے۔

پی-ایل-او (Palestine Liberation Organisation)

پی ایل او کی بنیاد 1964ء میں رکھی گئی۔ اس کا مقصد فلسطین کو آزادی دلوانا تھا۔ یہ تنظیم 1993ء تک مسلح جدّوجہد پر یقین رکھتی تھی اور اس پر عمل بھی کرتی تھی۔ اوسلو معاہدے کے تحت اسرائیل نے اس تنظیم کو فلسطین کی ایک نمائندہ تنظیم کے طور پر تسلیم کر لیا اور اس کے بدلے اس تنظیم نے بھی اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ پی ایل او صرف ایک مذہبی جماعت نہیں ہے بلکہ اس تنظیم میں عیسائی بھی شامل ہیں۔ فلسطین کے اندر ایک فلسطینی شہری کونسل بھی ہے جسے فلسطینی لوگ ہی منتخب کرتے ہیں۔ اسے اب فلسطین کی پارلیمنٹ بھی کہا جاتا ہے۔

پی ایل او کے پہلے چیئرمین احمد الشقیری تھے۔ 1969ء میں یاسر عرفات اس کے سربراہ بنے اور اپنی وفات تک (یعنی 2004ء تک تقریباً 35 سال) پی ایل او کے سربراہ رہے۔ ان کے بعد محمود عباس اس کے سربراہ بنے جو اب تک اس کی سربراہی کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ اس وقت محمود عباس فلسطین اتھارٹی کے صدر ہیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ پی ایل او کو کئی ممالک میں فلسطینیوں کی نمائندہ تنظیم کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ یاد رہے 1987ء میں اس تنظیم کو شدّت پسند تنظیم کے طور پر جانا جاتا تھا اور اس پر پابندی بھی لگائی گئی تھی۔ بعد ازاں اس پر سے پابندیاں ہٹا لی گئیں۔ خاص طور پر اس وقت جب اوسلو معاہدے کے بعد یاسر عرفات نے اسرائیلی وزیر اعظم کو ایک خط لکھ کر اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات کی تھی۔ اس کے بدلے میں اسرائیل نے پی ایل او کو فلسطینی عوام کی نمائندہ تنظیم کے طور پر تسلیم کر لیا۔

پی ایل او نے فلسطین کی آزادی کے لیے ایک طویل جنگ لڑی۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ پی ایل او کو ہمیشہ روس کی حمایت حاصل رہی ہے۔ اسی لیے اسے ایک بائیں بازو کی جماعت بھی کہا جاتا ہے۔ ایک طویل عرصے سے عرب دنیا روس اور امریکہ کے زیرِ اثر ہے۔ ایک طرف امریکہ اسرائیل کے ساتھ ساتھ کئی عرب ممالک (خاص طور پر سعودی عرب) کی حمایت کرتا ہے تو دوسری طرف روس نے عرب میں امریکہ

مخالف ایک گروہ بنا رکھا ہے۔ جس میں کئی عرب ممالک شامل ہیں۔ فلسطین بھی اسی گروپ کا ایک حصّہ ہے۔

فتح: فلسطینیوں کی ایک اہم تنظیم

اس تنظیم کا نام پہلے Palestinian National Liberation Movement تھا بعد میں اسے Palestinian Nationalist Social Democratic Political Party بھی کہا جانے لگا۔

عربی میں اس کا نام "حرکۃ التحریر الوطنی الفلسطینی" ہے۔ اس نام کے حروف کو اگر الٹی طرف سے پڑھا جائے تو یہ فتح بنتا ہے۔ اس تنظیم کی بنیاد 1959ء میں ان فلسطینی مہاجر طالب علموں نے رکھی جو مصر کے علاوہ دیگر عرب ممالک میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کے بانیوں میں یاسر عرفات کا نام بھی آتا ہے۔ 1967ء میں یہ تنظیم پی ایل او کا حصّہ بن گئی اور اسے پی ایل او میں ایک نمایاں حیثیت دے دی گئی۔ 1969ء میں یاسر عرفات پی ایل او کے چیئرمین بن گئے۔ اس سے ہمیں ان تین تنظیموں کے درمیان تعلقات اور معاملات سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

فتح دنیا بھر میں یہودیوں کے خلاف مسلح جدّو جہد کا ایک استعارہ سمجھی جاتی تھی۔ بنیادی طور پر یہ مسلح کاروائیوں پر یقین رکھتی تھی۔ ان کی جنگوں کی طویل داستان ہے جس میں بے شمار لوگ مارے گئے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اوسلو معاہدہ کے بعد

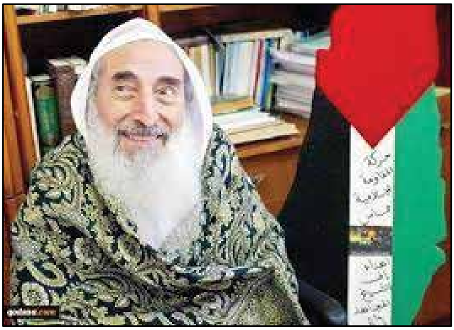
"Palestinian National Authority

السلطۃ الوطنیۃ الفلسطینیۃ"

جسے عام طور پر PA بھی کہا جاتا ہے، بنائی گئی جس کے سربراہ یاسر عرفات تھے۔ یہ درحقیقت پی ایل او کی جگہ پر سیاسی معاملات چلانے کے لیے بنائی گئی تھی لیکن اس کا اصل کنٹرول پی ایل او کے پاس ہی تھا۔ میں اسے پی ایل او کا سیاسی ونگ کہہ سکتا ہوں۔

اس طرح سے یہ تین مختلف تنظیمیں (پی ایل او، فتح اور پی اے) ایک ہی مقصد کے لیے کام کرتی تھیں۔ پہلے فتح کی بنیاد رکھی گئی پھر پی ایل او بنائی گئی اور بعد میں پی ایل او کو فتح کا حصّہ بنا دیا گیا۔ اوسلو معاہدے کے بعد پی اے وجود میں آئی۔ فلسطین کے سرکاری معاملات کو چلانے کے لیے فلسطین نیشنل پارٹی بنائی گئی جس کے موجودہ سربراہ محمود عباس ہیں۔

2006ء کے الیکشن میں پی اے اپنی اکثریت کھو بیٹھی اور حماس نے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کی، لیکن دنیا کو حماس کی جیت پسند نہ آئی اور جمہوریت پسند لوگوں نے ہی اس کی مخالفت شروع کردی اسی وجہ سے حماس اور فتح کے درمیان ایک جنگ کی کیفیت پیدا ہوئی جو اب تک جاری ہے۔





Hammas Founder Sh. Ahmed Yasin

Photo Credit: http://qodsna.com

Israel Army Photo Credit:

https://www.dawn.com



PLO Chairman Yasir Irfat Photo Credit: https://www.alamy.com

فلسطین اور اسرائیل مذاکرات اور معاہدے

فلسطین اور اسرائیل کے درمیان پچھلے ستّر سال سے زائد عرصے سے مذاکرات اور معاہدوں کا سلسلہ چل رہا ہے۔اس سے پہلے کہ میں ان کی تفصیل بیان کروں میں چاہوں گا کہ آپ کے سامنے اس مسئلے کے تین بڑے فریقین (یعنی فلسطین،اسرائیل اور امریکہ) کے خیالات بھی رکھوں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ عرب اور یورپ کے علاوہ مسلمان دنیا بھی اس کی اہم فریق ہے۔یہ بات بھی درست ہے کہ یہ سب لوگ امن کے توخواہاں ہیں لیکن عملی طور پر فلسطین،اسرائیل اور امریکہ ہی متحرک ہیں۔اب تک میں نے جو تھوڑا بہت اس مسئلے کو جانا ہے اس کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ در حقیقت یہ مسئلہ اسرائیل اور فلسطین کے درمیان ہے لیکن اسرائیل کی اصل طاقت امریکہ ہے۔اسرائیل سے متعلق جب بھی سیکیورٹی کونسل میں کوئی بات کی جاتی ہے تو امریکہ ویٹو کا استعمال کرتا ہے۔اس لیے مسئلہ فلسطین پر ان تینوں کا نقطہ نظر جاننا بہت ضروری ہے تاکہ ہمیں علم ہو سکے کہ اب تک اتنی بار مذاکرات اور معاہدے ہونے کے بعد بھی یہ مسئلہ حل کیوں نہ ہو سکا۔

فلسطین کا نقطۂ نظر

فلسطینیوں کا یہ کہنا ہے کہ ان کی سرزمین پر اسرائیل کا قیام کسی بھی شکل میں قابل قبول نہیں ہے لیکن اب ایسا ہو چکا ہے اسی لیے اب ان کی اس سوچ میں فرق بھی آیا ہے۔یاد رہے فلسطین کے بہت سے گروہوں میں (جیسے پی ایل او اور حماس) میں بھی آپس میں ان معاملات پر اختلاف پایا جاتا ہے۔

فلسطین نے مختلف ادوار میں جو معاہدے کیے ان معاہدوں کے مطابق وہ اسرائیلی ریاست کو تسلیم بھی کرتے ہیں اور اس بات کا مطالبہ بھی کرتے ہیں کہ یہودیوں کو ایک مخصوص حصّے میں ہی رہنا چاہیے اور فلسطین کے علاقوں (غزہ کی پٹی،ویسٹ بنک) سے اسرائیل کی فوجوں کو واپس جانا چاہیے اور یہودیوں کی نئی بستیوں کو ختم ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

میں جو بات سمجھ سکا ہوں اس کے مطابق فلسطین کے بہت سے لوگ اب تک دو ریاستی حل کی طرف جانا چاہتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ اسرائیل کا وجود کسی بھی حالت میں قابلِ

قبول نہیں اور 1948ء سے پہلے کا فلسطین ہی ہو جس میں یہودی ایک شہری کی حیثیت سے رہ سکیں۔ مذاکرات اور مختلف ادوار میں ہونے والے معاہدوں کو دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کئی دفعہ فلسطینیوں نے امن کی کوشش کی ہے لیکن اسرائیل کی ہٹ دھرمی بھی ہمیشہ ہی آڑے آئی ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ فلسطین میں موجود کئی انتہا پسند لوگوں کی وجہ سے بھی امن ممکن نہیں ہے۔

اسرائیل اور امریکہ کا موقف

ایلن پاپی (جو اسرائیل اور فلسطین کے مسئلے پر ایک اتھارٹی سمجھا جاتا ہے) نے اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اس کی ایک کتاب One Land, Two Peoples میں وہ لکھتا ہے کہ اسرائیل کا ایک پرانا روایتی نقطۂ نظر (Traditional Narrative) تھا اور ایک نیا نقطۂ نظر ہے (Modern Narartive)۔

ایلن پاپی کے مطابق روایتی نقطۂ نظر کے مطابق اسرائیل کا یہ کہنا ہے کہ انھوں نے 1940ء میں عربوں کے ساتھ مذاکرات شروع کیے اور انھیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ فلسطین کے اندر ایک مخصوص حصّے کو یہودیوں کا وطن قرار دیا جائے لیکن انھوں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں یہودیوں نے دنیا بھر سے لوگوں کو لا کر اسرائیل میں آباد کرنا شروع کیا اور اب وہ اس میں آباد ہو چکے ہیں۔ اس وقت وہ آبادی کے لحاظ سے فلسطینیوں سے بھی زیادہ ہیں۔ پہلی عرب اسرائیل جنگ اور بعد میں چھ روزہ جنگ کے نتیجے میں انھوں نے بہت سے علاقوں پر قبضہ بھی کر لیا اور اب جن علاقوں پر قابض ہیں وہاں قابض رہیں گے اور عرب ممالک کو یہ تسلیم بھی کرنا پڑے گا۔

یہ بھی یاد رہے کہ 1988ء میں پی ایل او نے سرکاری سطح پر اسرائیل کو تسلیم کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسرائیل کا یہ مطالبہ بھی ہے کہ فلسطین کے اندر سے ان کے خلاف لڑنے والے جنگجو گروہوں کو بھی ختم کیا جائے۔

ایلن پاپی کا یہ بھی کہنا ہے کہ اب اسرائیل میں ایک نیا بیانیہ بھی جنم لے رہا ہے۔ اس بیانیے کے مطابق اسرائیلی اس بات پر تیار ہیں کہ امن کی خاطر انھیں دو ریاستی حل قبول کرنا چاہیے اور وہ امن کی خاطر پرانی سرحدوں پر جانے کے لیے بھی کسی حد تک تیار ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی طاقت میں بھی

اضافہ کرتے جارہے ہیں۔ دنیا بھر سے ابھی بھی ہزاروں کی تعداد میں یہودی ہر سال اسرائیل میں آکر آباد ہوتے ہیں۔

اسرائیلی بار بار مذاکرات بھی کرتے ہیں جو اس بات کی نشاندہی ہے کہ وہ اس مسئلے کا ایک پر امن حل چاہتے ہیں۔ وہ جنگ کی بجائے امن کو ترجیح دینا چاہتے ہیں لیکن ابھی تک ایسا ممکن نہیں ہوا۔ مذاکرات بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن کسی معمولی بات پر جنگ بھی چھڑ جاتی ہے جیسا کہ ابھی حال ہی میں ایک گیارہ روزہ جنگ ہوئی جو ایک مسجد میں یہودیوں کی طرف سے کیے گئے ایک ایکشن سے شروع ہوئی اور پھر ایک جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ سینکڑوں لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بے حد مالی نقصان بھی ہوا۔ پوری دنیا کوشش کے باوجود بھی جنگ بندی نہ کروا سکی اور یہ جنگ گیارہ دن تک چلتی رہی۔

اس مسئلے کا تیسرا فریق امریکہ ہے۔ امریکہ کا مئوقف ان الفاظ سے ہی واضح ہوتا ہے جو اس 11 روزہ جنگ کے آغاز میں امریکی صدر بائیڈن نے کہا کہ اسرائیل کو اپنے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ وہ اسرائیل کا بہت بڑا حمایتی ہے اور اس کی بے حد مالی اور فوجی مدد بھی کرتا ہے۔ وہی اسرائیل کو بڑی تعداد میں اسلحہ بھی فروخت کرتا ہے۔ یاد رہے کہ فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے درمیان مذاکرات کی سب سے زیادہ کوششیں بھی امریکہ نے ہی کی ہیں۔

اسرائیل میں دو طرح کے لوگ طاقت کا اصل سرچشمہ ہیں۔ ایک گروہ کو دائیں بازو والے لوگ کہا جاتا ہے (Rightest) ۔ ان میں سیکولر اور مذہبی دونوں طرح کے لوگ ہیں۔ آپ انھیں شدّت پسند یہودی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ فلسطین کے ساتھ کسی بھی طرح کی رعایت نہ کی جائے اور ان کا کوئی بھی مطالبہ تسلیم نہ کیا جائے۔ دوسرا گروپ جو بائیں بازو کا نظریہ رکھتے ہیں انھیں Leftist کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ فلسطینیوں کے لیے ایک خود مختار ریاست ہونی چاہیے اور اسرائیل کو امن کی خاطر فلسطین کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہیے لیکن نیتن یاھو کی حالیہ قیادت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ فلسطین کے ساتھ کسی بھی طرح کا معاملہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ صرف طاقت کے استعمال سے فلسطین کے لوگوں کو مزید تنگ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مختلف سروے یہ بھی بتاتے ہیں کہ اب عام اسرائیلی بھی یہ چاہتا ہے کہ مزید جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ اس رائے میں کئی اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ اب بھی کبھی فلسطین کی طرف سے کوئی فوجی کاروائی ہوتی ہے تو اسرائیلی عوام کی رائے بدل جاتی ہے۔

اسرائیل ڈیموکریسی انسٹی ٹیوٹ نے 2010ء میں ایک سروے کیا جس کے مطابق 66 فیصد یہودی اسرائیلیوں نے دو ریاستی حل کو ترجیح دی۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ ایک ہی ریاست ہونی چاہیئے جس میں عرب اور یہودی مل جل کر رہیں۔ فلسطین کے تمام علاقے بھی اسرائیل میں شامل کر لیے جائیں۔ اسے Bi-National ریاست کا نام دیا گیا۔ اکثر لوگوں کے نزدیک دو ریاستی نظام ہی واحد حل ہے۔

میں اس سے یہ بات جان سکا ہوں کہ امریکہ چاہتا ہے کہ مذاکرات کے ذریعے اسرائیل کی ریاست تمام عرب تسلیم کر لیں اور اسے ہر صورت قائم رکھا جائے۔ (حال ہی میں کئی عرب اور افریقی ممالک نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے)۔ اب تک بیان کیے گئے تینوں فریقوں کے نقطۂ نظر سے یہ بات واضح ہے کہ اب سوائے اس کے کوئی نہیں ہے کہ ایک دو ریاستی نظام کی طرف جایا جائے، لیکن کیسے؟ ایک خوفناک ماضی کو بھلانا آسان نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو مجھے مستقبل قریب میں تو حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ اللہ کرے کوئی امن کی جلد صورت پیدا ہو۔ (آمین)

میں 70 سال میں ہونے والے مذاکرات اور معاہدوں کی ایک جھلک آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا۔



Oslo Accord Photo Credit: https://edition.cnn.com/



President Bush with Israeli Prime Minister Ehud Olmert and Palestinian President Mahmoud Abbas today in Annapolis.Photo Credit; https://www.nytimes.com

فلسطین اسرائیل امن مذاکرات اور معاہدے

فلسطین اور اسرائیل کے درمیان مذاکرات اور معاہدے ایک تسلسل سے جاری ہیں۔ ان معاہدوں اور مذاکرات کا آغاز اسرائیل کے قیام سے قبل ہی ہو چکا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا سال گزرا ہو جب فلسطین اور اسرائیل کے درمیان میں مذاکرات نہ ہوئے ہوں اور کوئی نہ کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو۔ اب صورت حال یہ ہے کہ فلسطین اور اسرائیل کے درمیان ہونے والی بات چیت کو پیس پروسس (Peace Process) کا نام دیا جاتا ہے (اس کا مطلب تو یہی ہوتا ہے کہ ایسا کام جو ابھی تک جاری ہے)۔ ان معاہدوں کی تفصیل یہودیوں کی ایک لائبریری میں موجود ہے۔ فلسطین اور اسرائیل کے درمیان معاہدوں کی ایک تاریخ طویل ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق 1982ء سے 2017ء تک 22 مرتبہ کوئی نہ کوئی مذاکرات یا معاہدے ہوئے ہیں۔ یعنی تقریباً 35 سال میں 22 مرتبہ فلسطین اور اسرائیل کے درمیان بات چیت ہوئی ہے۔ یہ بات چیت براہ راست بھی ہوئی ہے اور بالواسطہ بھی۔

ان تمام معاہدوں کی تفصیل لکھنا ممکن نہیں ہے لیکن میں ان میں سے چند ایک کا مختصر تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گا۔

یاد رہے کہ ایسے معاہدے بھی ہوئے ہیں جن کا تعلق تو فلسطین سے تھا لیکن اس میں فلسطین شامل نہیں تھا، جیسے اسرائیل اور مصر کا معاہدہ۔ اسی طرح 1948ء کی جنگ کے بعد 1949ء میں ایک معاہدہ اسرائیل، لبنان، مصر اور شام کے درمیان ہوا جس میں جنگ بندی کا اعلان کیا گیا اور ایک سرحد کا تعین کیا گیا۔ جسے گرین لائن کا نام دیا جاتا ہے اور یو این او اس کی نگرانی کرتی ہے۔ یہ سرحد چھ روزہ جنگ تک برقرار رہتی ہے۔ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد اسرائیل اس سرحد کی خلاف ورزی کرتا ہے اور عربوں کے کئی علاقے قبضے میں لے لیتا ہے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں اسرائیل اس علاقے کے 78 فیصد پر قابض ہو جاتا ہے جبکہ یو این او کی 1947ء کی قرارداد کے مطابق اسرائیل کا حصّہ صرف پچاس فیصد تھا۔

فلسطین کا کل علاقہ 28 ہزار مربع کلومیٹر تھا۔ جس میں سے 22 ہزار مربع کلومیٹر (تقریباً 80 فیصد حصّے) سے زائد علاقے پر اسرائیل نے قبضہ کر رکھا ہے اور صرف بیس فیصد علاقہ فلسطینیوں کے پاس

ہے۔ جس کے چاروں طرف اسرائیل کا قبضہ ہے۔ ایک طرح سے فلسطینی چاروں طرف سے اپنے دشمن کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی آمدورفت پر بھی اسرائیل کا مکمل کنٹرول ہے۔

اوسلو معاہدہ

اب تک ہونے والے معاہدوں میں اوسلو معاہدے کو ایک بڑا اور اہم ترین معاہدہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ امریکی صدر بل کلنٹن کی موجودگی میں، پی ایل او کے چیئرمین یاسر عرفات اور اسرائیلی وزیراعظم اضحاک رابن کے درمیان اوسلو میں 1993ء میں کیا گیا۔ اسی وجہ سے اسے اوسلو معاہدہ کہا جاتا ہے۔

اس معاہدے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ پی ایل او کے صدر جناب یاسر عرفات نے اسرائیل کے وجود کو تسلیم کیا اور شدّت پسندوں کی کاروائیوں کی مذمت کی اور یہ یقین دہانی کروائی کہ فلسطینی آئندہ کوئی بھی ایسی کاروائی نہیں کریں گے۔ اس کے جواب میں اسرائیل سے پی ایل او کو فلسطینیوں کے ایک نمائندے کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ یاد رہے اس معاہدے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ فلسطین اور اسرائیل کے درمیان تجارتی تعلقات بھی قائم کیے جائیں گے۔

بڑی سطح پر مذاکرات کے بعد دونوں طرف کے مختلف نمائندوں کے درمیان ڈیکلئیریشن آف پرنسپل جاری کیا گیا جسے عام طور پر ڈی او پی بھی کہا جاتا ہے۔

اس پر کتنا عمل ہوا اور اس کے کیا اثرات ہوئے یہ ایک الگ موضوع ہے۔ جس طریقے سے اس وقت فلسطین اور اسرائیل کے درمیان جنگ کی کیفیت تھی وہ آج بھی اسی طرح ہی ہے جس سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس معاہدے سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔

کیمپ ڈیوڈ معاہدہ

کیمپ ڈیوڈ معاہدہ 2000ء میں جو بل کلنٹن کی سربراہی میں کیا گیا اسے اسرائیل اور فلسطین کے درمیان اب تک کیے جانے والے معاہدوں میں سے سب سے اہم معاہدہ مانا جاتا ہے۔

معاہدے میں فلسطین کے صدر یاسر عرفات اور اسرائیل کے پرائم منسٹر Ehud Barak شریک ہوئے۔ اس ملاقات کا اہتمام بھی کلنٹن نے ہی کیا۔ اس بار یہ طے کیا گیا کہ ویسٹ بنک کا 66 فیصد حصّہ

فلسطین کو ملے گا اور 17 فیصد اسرائیل کا حصّہ ہو گا، وہ 17 فیصد اسرائیل کا حصّہ تو نہیں ہو گا لیکن اس پر اسرائیل کا کنٹرول ضرور ہو گا۔ اسی طرح بہت سارے قدرتی وسائل کی تقسیم بھی کی گئی۔

اہم بات یہ تھی مشرقی یروشلم کے بارے میں کئی ایسی شرائط پیش کی گئیں جو فلسطین کے لوگوں کو قبول نہ تھیں۔ شروع میں ایک ڈرافٹ تیار کیا گیا جس میں بعدازاں کئی ترامیم کی گئیں۔ اسرائیلی وزیر اعظم نے یہ بھی کہا کہ وہ غزہ اور ویسٹ بنک کا 95 فیصد حصّہ فلسطین کو دینے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ فلسطین یہودی بستیوں کو اسرائیل کا حصّہ بنانے پر تیار ہو۔

ایک طویل بحث و مباحثہ کے بعد ایک معاہدہ تو ہوا لیکن وہ بھی زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد بھی بے شمار معاہدے ہوئے ہیں لیکن کوئی بھی خاطر خواہ کامیاب نہ ہوا۔

جارج بش اور اسرائیل، فلسطین مذاکرات

2002ء میں جارج بش نے مذاکرات کا سلسلہ پھر سے شروع کیا۔ اُس نے اسرائیل کے وزیر اعظم ایریل شیرون اور صدر محمود عباس کو ایک میز پر بٹھایا۔ اس معاہدے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اصل مسئلے کو ایک طرف رکھا جائے اور جنگی کیفیت میں کمی لائی جائے۔ فلسطینی عوام کو پابند کیا جائے کہ وہ اسرائیل کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کریں گے۔ یہ ایک طرح سے جنگ بندی کا منصوبہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسرائیل کو بھی یہ کہا گیا کہ وہ بھی اپنی کاروائیاں بند کرے گا۔ یہ معاہدہ اصل مسئلے کو حل کرنے کے لیے جنگی صورتحال کو نارمل کرنے کی ایک کوشش تھی جو بظاہر کامیاب نہ ہوئی۔

اسرائیل فلسطین براہِ راست مذاکرات

2007ء میں ایک بار پھر اسرائیلی پرائم منسٹر Ehud Olmert اور فلسطینی صدر محمود عباس کے درمیان 36 مرتبہ مذاکرات ہوئے۔ یہ بہت ہی طویل مذاکرات تھے۔ ان مذاکرات کا دورانیہ دو سال پر مشتمل تھا۔

اتنی دفعہ مذاکرات ہونے سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مذاکرات کرنے والے مسئلہ حل کرنے میں سنجیدہ ہیں اور دوسری یہ کہ اس مسئلے کا کوئی آسان حل نظر نہیں آتا۔ اس دوران حماس کا غزہ

پر قبضہ ہو گیااور امن کی کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں اور ایک دفعہ پھر 2008ء میں جنگ کی صورتحال پیدا ہو گئی۔

باراک اوباما اور فلسطین

باراک اوباما نے بھی اپنا فرض سمجھتے ہوئے اس مسئلے میں اپنا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے فلسطین اور اسرائیل کے درمیان مذاکرات کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے فلسطین اور اسرائیل کی قیادت کے درمیان براہِ راست مذاکرات کا اہتمام کیا۔

اس میں بھی اس بات پر زور دیا گیا کہ فلسطین ہر حال میں یروشلم پر اسرائیل کا قبضہ قبول کرلے۔ اس سلسلے میں اوباما نے دو سال تک کوشش کی۔ ہیلری کلنٹن بھی کافی متحرک رہیں۔ ان سب کی یہ کوشش تھی کہ کسی طریقے سے اس مسئلے کا کوئی حل نکالا جائے۔

ایک موقع پر محمود عباس نے کہا کہ وہ کسی نہ کسی طرح زمین کے تبادلے کے لیے تیار ہیں۔ یہ سب باتیں ہونے کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ باراک اوباما بھی اس مسئلے کو حل کرنے میں ناکام رہے۔ اس طرح مذاکرات کا یہ سلسلہ 2013ء تک جاری رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ جنگ بھی جاری رہی اور اسرائیل اپنی بستیوں میں اضافہ کرتا رہا۔

محمود عباس کا امن معاہدہ اور ٹرمپ کا اعلان یروشلم

فلسطینی صدر محمود عباس نے 2014ء میں ایک امن معاہدہ پیش کیا۔ جس میں اس وقت امریکہ کے وزیر خارجہ جان کیری نے اہم کردار ادا کیا۔ اس معاہدے میں یہ کہا گیا تھا کہ اسرائیل 1967ء سے پہلے کی سرحدوں کا احترام کرے اور یروشلم مکمل طور پر فلسطین کے حوالے کرے۔ یہ تجویز امریکہ کی طرف سے مسترد کر دی گئی۔

اس کے بعد صدر ٹرمپ نے بھی اس مسئلے کے حل میں اپنا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جب اس نے یہ اعلان کیا کہ یروشلم، اسرائیل کا صدر مقام ہو گا تو اس سے اب تک ہونے والے تمام معاہدوں پر پانی پھر گیا اور اہلِ فلسطین کو یہ اندازہ ہو گیا کہ امریکہ کسی بھی طرح سے اسرائیل کو ناراض نہیں کرنا چاہتا یوں اب تک کی گئی تمام تر کوششیں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ 73 سال پہلے شروع ہونے والی جنگ اب بھی جاری ہے۔

اب تک میں نے جو دیکھا اس سے میں یہ جان سکا ہوں کہ جو بھی معاہدے کیے گئے ان کی سربراہی امریکہ ہی کے پاس تھی۔ امریکہ ہی اسرائیل کا اصل پشت پناہ ہے۔ اس طرح ہر بار امریکہ نے اسرائیل کی ہی حمایت کی۔ اسی لیے ان معاہدوں میں ہمیں کہیں انصاف ہوتا نظر نہیں آیا۔

اگر کبھی فلسطینی لیڈرشپ نے کسی معاہدے کو تسلیم بھی کیا تو فلسطینی عوام نے اس ے ماننے سے انکار کر دیا اور جب بھی کسی بھی معاہدے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی تو بے شمار مسائل پیدا ہوئے۔ اس لیے آج کی تاریخ تک یہ کہا جا سکتا ہے کوئی بھی معاہدہ کامیاب نہیں ہوا۔ ایک طرف معاہدے ناکام ہوئے اور دوسری طرف یہودیوں نے اپنی آبادی میں بھی اضافہ جاری رکھا اور مزید علاقوں میں اپنی بستیاں بھی بساتے رہے۔

اب حالت یہ ہے کہ وہ یہودی جو کبھی تین فیصد تھے اب وہ اس پورے خطے کی آبادی کا ساٹھ فیصد سے زائد ہیں اور اس علاقے کے ستّر فیصد علاقے پر قابض ہیں۔۔



The Peace Process Photo credit: https://lobelog.com/the-peace-process-is-dead-thanks-obama/



US President Donald Trump reaches to shake Palestinian Authority President Mahmoud Abbas

Photo Credit: https://www.timesofisrael.com

او آئی سی اور فلسطین، اسرائیل تنازعہ

مسلمان ممالک نے 1969ء میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے Organisation of Islamic Cooperation (او آئی سی) کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔ اس وقت اس تنظیم کے 57 ممبر ہیں اور ان ممبر ممالک میں بسنے والے لوگوں کی تعداد دو ارب کے قریب ہے۔ ان 57 ممالک میں 49 ممالک ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس تنظیم کا مقصد مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنا ہے۔

اس تنظیم کا پہلا اجلاس 1969ء میں مراکش کے شہر رباط میں ہوا۔ ایک قرارداد کے ذریعے یہ طے کیا گیا کہ یہ تنظیم مسلمانوں کے باہمی مسائل کو بھی حل کرنے میں مدد دے گی اور ان کے درمیان تعاون میں اضافے کی کوشش بھی کرے گی۔

کہتے ہیں کہ اس تنظیم کی بنیاد فلسطین کے مفتی اعظم امیر الحسینی کی درخواست پر رکھی گئی۔ ان کا کہنا تھا کہ جو کچھ اسرائیل، فلسطین میں کر رہا ہے اسے روکنے کا واحد حل مسلمانوں کا اتحاد ہے۔ میں اس وقت اس تنظیم کی تفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا بلکہ آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس تنظیم نے فلسطین اور اسرائیل کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعے کو حل کروانے میں کیا کردار ادا کیا؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ او آئی سی نے فلسطین اور اسرائیل کے مسئلے پر ہمیشہ ہی سنجیدگی سے کام کیا ہے لیکن یاد رہے یہ تنظیم کوئی فوجی تنظیم نہیں ہے۔ یہ دنیا کے مختلف فورمز پر اپنی آواز بھی اٹھاتی ہے اور دیرپا حل کے لیے کوشش بھی کرتی ہے۔ او آئی سی نے اس کام کے لیے بے شمار کانفرنسز کا اہتمام بھی کیا، لیکن او آئی سی کی آواز کو کسی نے اہمیت نہیں دی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تنظیم فلسطین، اسرائیل کے مسئلے کو حل کروانے میں زیادہ اہم کردار ادا نہیں کر سکی۔

جنگ رمضان: اپریل- مئی، 2021ء

ابھی حال ہی میں ماہِ رمضان میں ایک گیارہ روزہ جنگ لڑی گئی۔ ایک طرف اسرائیل کے میزائل تھے اور دوسری طرف غزہ کی پٹی سے دیسی ساخت کے راکٹ۔ اس جنگ میں شیخ جراح کے علاقے کا ذکر بار بار سامنے آیا۔ اس علاقے کی تاریخ کا جاننا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ یہ علم ہو سکے کہ جنگ رمضان (یہ نام میں نے دیا ہے) کیوں شروع ہوئی اور اس کی اصل وجہ کیا تھی۔

یاد رہے فلسطین اور اسرائیل کے درمیان کبھی بھی امن نہیں رہا۔ یہ دونوں ہر وقت حالت جنگ میں رہتے ہیں اور کوئی معمولی واقعہ بھی کسی بڑی جنگ کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

یہودیوں کا کہنا ہے کہ یہاں پر شیخ جراح (جو کہ ایک قدیم علاقہ) ان کی ملکیت ہے۔ اس جگہ کا جھگڑا پچھلے ستر سال سے چلا آرہا ہے۔ یہ مشرقی یروشلم میں واقع ہے اور اس میں سو کے قریب فلسطینی خاندان آباد ہیں۔ جگہ کی ملکیت کے لیے یہودیوں نے اسرائیلی عدالت میں ایک کیس بھی کر رکھا تھا۔ فلسطینیوں کو یہ ڈر تھا کہ عدالت ان کے خلاف فیصلہ دے گی اور اس طرح ان کے اس علاقے سے بے دخل ہونے کا خطرہ موجود تھا جبکہ یہودیوں کا یہ کہنا تھا کہ انھوں نے 1870 میں (سلطنت عثمانیہ کے دور میں) عربوں سے اس جگہ کو خریدا تھا لیکن فلسطینی ان کے اس دعوے کو نہیں مانتے۔

پھر ایک وقت آیا کہ یہ علاقہ اردن کے کنٹرول میں چلا گیا۔ چھ روزہ جنگ کے بعد اسرائیل نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور وہ قانون بنایا جس کے تحت یہ علاقہ یہودیوں کو مل سکتا تھا۔ اس دوران بہت سے مذاکرات بھی ہوئے۔ انٹر نیشنل فورسز نے بھی اپنا کام کیا لیکن مسئلہ جوں کا توں رہا۔ اسی خوف نے ان لوگوں کے درمیان عدم تحفظ کا احساس بھی پیدا کر دیا۔ رمضان میں جب مسلمان مسجد القدس میں نماز کے لیے اکٹھے ہوئے تو اسرائیلی پولیس نے ان پر تشدد کیا اور مسجد کو بند کر دیا۔

اس طرح یہ واقعہ ایک بڑی جنگ کی بنیاد بن گیا۔

اس دوران جب مسلمان شب قدر منا رہے تھے تو اسرائیل کا بھی کوئی قومی دن آگیا۔ اب کی بار یہ لڑائی یروشلم میں بسنے والے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہونا شروع ہو گئی۔ یاد رہے مشرقی یروشلم پر اسرائیل کا قبضہ ہے جب کہ اس علاقے میں مسلمان بھی آباد ہیں۔

مختصر یہ کہ پھر ایک وقت آیا جب ویسٹ بنک (مغربی یروشلم) اور غزہ کی پٹی میں مسلمانوں نے ایک بہت بڑے پیانے پر احتجاج شروع کر دیا۔ اسرائیل کے ان علاقوں میں جہاں عرب مسلمان اور یہودی رہتے تھے، کے درمیان بھی ایک خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

اس ساری صورتحال میں حماس نے اسرائیل کو الٹی میٹم دیا کہ وہ مسجد القدس سے اپنی پولیس ہٹا لے لیکن ایسا نہ ہوا اور پھر ایک دن آیا جب حماس نے اسرائیل پر راکٹ برسانے شروع کر دیئے۔ اسرائیل کے پاس دفاعی نظام موجود ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ راکٹ ان کی زمین تک نہ پہنچ سکے لیکن پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ 30 فیصد راکٹ اسرائیل کے علاقے میں گرے۔ جس سے اسرائیل میں خوف وہراس کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اسرائیل نے جوابی ہوائی حملے شروع کر دیئے۔

پھر دنیا نے دیکھا کہ اسرائیل نے ایک تیرہ منزلہ ٹاور کو ایک بم کے ذریعے تباہ کر دیا۔ وہ ایک کمرشل پلازہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی ہر اس عمارت کو نشانہ بنایا گیا جہاں سے کوئی راکٹ فائر کیا جاتا تھا۔

یہ جنگ گیارہ دن تک جاری رہی اور پھر مختلف لوگوں کی کوشش سے جنگ بندی ہوئی۔ کہتے ہیں کہ جنگ بندی کا معاہدہ اسرائیل کی درخواست پر ہوا اور اس میں حماس کی شرائط کو تسلیم کیا گیا جبکہ اسرائیل کا مئوقف ہے کہ جنگ بندی کے لئے ان کی شرائط بھی تسلیم ہوئی ہیں۔

جنگ کے دوران اسرائیل کے 13 لوگ مارے گئے جبکہ دو سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ دوسری جانب اڑھائی سو سے زیادہ فلسطینی شہید ہوئے۔ جن میں ساٹھ بچے اور چالیس عورتیں بھی شامل ہیں۔ زخمیوں کی تعداد دو ہزار سے بھی زائد ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق حماس نے چھ سو سے زائد راکٹ فائر کیے۔ حماس نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کے کئی بڑے کمانڈر بھی اس جنگ میں شہید ہوئے اور غزہ کی پٹی پر بہت سی سرکاری عمارتیں بھی تباہ ہوئیں۔ یہ ایک وقتی جنگ بندی ہے اور لگتا یہی ہے کہ جب تک اس مسئلے کا کوئی مستقل حل نہیں نکلے گا، کسی نہ کسی صورت میں جنگ جاری رہے گی۔



تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال نے کئی خاندانوں کو اُنکے آبائی علاقوں سے ہجرت پر مجبور کر دیا اور اُنھی بدقسمت لوگوں میں ایک میرا خاندان بھی شامل تھا جو موجودہ بھارت کی ریاست پٹیالہ کے شہر سر ہند سے ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ سکونت پذیر ہوئے۔ میری پیدائش 15 مارچ 1958ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوئی۔ میں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ اور فیصل آباد میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے Textile کے شعبے کا انتخاب کیا اور 1981ء میں نیشنل کالج سے Textile Engineering کی ڈگری مکمل کی۔ اپنی مہارت کو مزید تقویت دینے کیلئے میں نے مختلف ملازمتوں سے تجربہ حاصل کیا اور 1992ء کے بعد سے اپنے ذاتی کاروبار کا آغاز کیا۔ مسلسل سیکھنے کے اصول پر کارفرما رہتے ہوئے میں نے اپنے انتہائی مصروف اوقات میں سے وقت نکال کر 2001ء میں University of Management Technolog سے MBA میں گولڈ میڈل بھی حاصل کر لیا۔ علم کا اشتیاق بڑھا تو 2008ء میں The University of Manchester سے MPhil اور 2012ء میں Czech Republic کی معروف یونیورسٹی سے Textile میں PhD بھی کر لی۔ کاروباری مصروفیات کے ساتھ ساتھ میں کئی فلاحی اداروں (غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ، الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان اور تعاون فاؤنڈیشن) سے بھی منسلک رہا اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔

اس کتاب کا مواد کئی مُستند تاریخی حوالوں سے حاصل کیا گیا ہے اور حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ اُنھی حالات و واقعات کو بیان کیا جائے جن پر اجماعِ کثیر ہو لیکن پھر بھی اگر کسی تاریخ یا واقعے میں کوئی تضاد پایا جائے تو ہر حال میں اسکی اصلاح کی گنجائش موجود ہے۔ اس کتاب سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خرچ کی جائے گی۔

انشاءاللہ